فہرست

شذرات	مسئلۂ عراق اور مسلمانوں کا طرز عمل	منظور الحسن	۲
قرآنیات	البقرہ (۲: ۲۳۸-۲۴۲)	جاوید احمد غامدی	۷
معارفِ نبوی	اسلام میں بہترین بات اور انسان کے لیے خطرے کی چیز	زاویۂ فراہی	۱۱
دین و دانش	قانون دعوت	جاوید احمد غامدی	۱۳
حالات و وقائع	امریکہ کا کردار (۲)	ڈاکٹر محمد فاروق خان	۳۱
	عروج و زوال کا قانون (۳)	ریحان احمد یوسفی	۵۷
	عراق، امریکہ اور ہم	طالب محسن	۶۷
ادبیات	غزل	جاوید احمد غامدی	۶۹

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

مسئلہ عراق اور مسلمانوں کا طرز عمل

عراق کے خلاف امریکہ کے اعلان جنگ سے دنیا بھر کے مسلمان متفکر ہیں۔ انھیں خطرہ ہے کہ یہ جنگ اہل عراق کی تباہی پر منتج ہو سکتی ہے۔ اس کے نتیجے میں مسلمانوں کی جانیں تلف ہو سکتی، املاک برباد ہو سکتی اور بستیاں راکھ کا ڈھیر بن سکتی ہیں اور اس خطۂ ارضی میں ان کی تعمیر و ترقی کے راستے برسوں تک کے لیے مسدود ہو سکتے ہیں۔ اس موقع پر مسلمانوں کے عوام و خواص یہ خواہش رکھتے ہیں کہ ان کی قیادت علم جہاد بلند کرے اور اللہ کی نصرت کے بھروسے پر امریکہ کو بزور وقوت حملے سے روک دے اور اسے ایسی سزا دے کہ وہ آیندہ مسلمانوں کے خلاف جرأت کا تصور بھی نہ کر سکے۔ ہمارے ہاں یہ خواہش بالعموم تین ہی مقدمات کے حوالے سے سامنے آ رہی ہے۔

ایک یہ کہ اسلام میں مسلمانوں کے باہمی تعلق کی اساس رشتۂ اخوت پر استوار ہے۔ مسلمان بھائیوں کے بارے میں فکر مند ہونا، ان کی تعمیر و ترقی کی تمنا رکھنا، ان کے دکھ درد میں شریک ہونا اور اگر وقت پڑے تو ان کی حفاظت و بقا کے لیے اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنا اخوت کا عین تقاضا ہے۔

دوسرے یہ کہ امریکہ ایک مفاد پرست قوت ہے۔ اس نے اپنی طاقت دنیا پر اپنے اقتدار کے استحکام اور دوام کے لیے مختص کر رکھی ہے۔ اس مقصد کے لیے اگر اسے عدل و انصاف کے منافی اقدام بھی کرنا پڑے تو وہ اس سے بھی گریز نہیں کرتا۔ عراق پر اس کا جنگ مسلط کرنا اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو سراسر ظلم ہے۔

تیسرے یہ کہ اگر مسلمان اپنے اندر جذبۂ ایمانی بیدار کر کے ظالموں کے خلاف برسر پیکار ہو جائیں تو وہ اللہ تعالیٰ کی نصرت سے فیض یاب ہو سکتے ہیں۔ ان کی ابتدائی ایک ہزار سالہ تاریخ شاہد ہے کہ انھوں نے اپنی ہمت اور نصرت الٰہی کے بھروسے پر عظیم سلطنتوں کو زیر کیا ہے۔

ہمارے نزدیک یہ تینوں باتیں بنیادی طور پر درست ہیں، مگر ان کے ساتھ ساتھ بعض دوسرے حقائق بھی ہیں جن کے بغیر

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

یہ باتیں ادھوری ہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جذبۂ اخوت مسلمانوں کے وجود اجتماعی کی اساس ہے۔ امت کے تن مردہ میں زندگی کی اگر کوئی رمق باقی ہے تو اس کا سبب یہی جذبہ ہے۔ اسی نے کشمیر، فلسطین، افغانستان اور چیچنیا میں ہونے والی خون ریزی پر دنیا بھر کے مسلمانوں کو مغموم کر رکھا ہے اور اسی کی وجہ سے وہ اپنے نونہالوں کو بے دریغ میدان جنگ کی طرف روانہ کر رہے ہیں۔ چنانچہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ افتراق امت کے اس زمانے میں بھی اس جذبے کی بنا پر امت کی عظمت رفتہ کی بحالی کا خواب دیکھا جا سکتا ہے۔

اخوت کے اس بے پایاں جذبے سے کسی کو انکار نہیں، مگر اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ ایک عرصے سے امت مسلمہ کا شیرازہ بکھرا ہوا ہے۔ بین الاقوامی سیاست میں ان کی کوئی متفقہ پالیسی نہیں ہے۔ ہر ملک اپنے مقامی مفادات ہی کو ترجیح دیتا ہے۔ ایک ریاست کے مسلمانوں پر دوسری مسلمان ریاستوں کے دروازے اسی طرح بند ہوتے ہیں جس طرح غیر مسلموں کے لیے بند ہوتے ہیں۔ مسلمان ریاستیں آپس میں ایک دوسرے کے افرادی اور مادی وسائل کے استعمال کے لیے منصوبہ بندی نہیں کرتیں۔ نتیجۃً بعض ریاستوں میں مسلمان بھوکوں مرتے ہیں اور بعض میں مسلمان انتہائی عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ مزید براں یہ بھی حقیقت ہے کہ مسلمانوں میں اخوت کی گرمی جذبات اس وقت نظر نہیں آتی جب کوئی مسلمان ملک اخلاقی پستی کا اظہار کرتا ہے، دینی شعار سے غفلت برتتا ہے، عدل و انصاف کا خون کرتا ہے یا برادر ملک ہی سے برسر جنگ ہو جاتا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

یہ حقیقت اگر مسلم ہے تو پھر ہمارے نزدیک اس موقع پر جذبۂ اخوت کا صحیح اظہار یہ ہے کہ مسلمان اپنی تمام توجہ ایک دوسرے کی خیر و سلامتی اور تعمیر و ترقی پر مرتکز کریں۔ ان کے امیر ممالک غریب ممالک کو اقتصادی لحاظ سے مضبوط کرنے میں بھرپور تعاون کریں، انھیں سودی قرضوں سے نجات دلائیں، ان کے علاقوں میں سرمایہ کاری کریں، اپنی ریاستوں میں ان کے لیے روزگار کے مواقع پیدا کریں، ان کے ساتھ تجارتی معاہدے کریں، ان کی سرزمین پر درس گاہیں، تحقیقی مراکز اور رفاہی ادارے قائم کریں۔ اگر کوئی ملک سیاسی لحاظ سے بے حکمتی کی روش اختیار کر رہا ہے تو سب مل کر اسے روکیں، کسی ملک کی اخلاقی غلطیوں کو قبول کرنے کے بجائے اور اس معاملے میں اس کی مدد کرنے کے بجائے اس کے لیے تادیب و تنبیہ کا رویہ اختیار کریں۔ بین الاقوامی معاملات میں اپنے اجتماعی وجود کے حوالے سے ایک ہی پالیسی کو سامنے لے کر آئیں۔

دوسری بات بھی صحیح ہے کہ تاریخ کی ہر سپر پاور کی طرح امریکہ بھی دنیا کو اپنے نظریات اور مفادات ہی کی نظر سے دیکھ رہا ہے۔ اس کی ہر ممکن کوشش ہے کہ دنیا پر اس کا اقتدار ہمیشہ مسلم رہے؛ علم، اسلحہ اور اقتصاد میں اس کا کوئی ثانی نہ ہو؛ اقوام عالم اس کی بالادستی کو برضا و رغبت یا طوعاً و کرہاً تسلیم کرتی ہوں؛ ریاستوں کے باہمی معاملات اس کی منشا کے مطابق تشکیل پائیں اور اس کی تہذیب دیگر تمام تہذیبوں پر غالب ہو۔ غالباً اسی زاویۂ نظر کا نتیجہ ہے کہ وہ جمہوریت کا علم بردار ہے، لیکن اگر اپنے

اقتدار کا سوال پیدا ہو جائے تو اس کے وجود سے آمریت ہی کا صدور ہوتا ہے۔ وہ امن، انصاف، آزادی، حق خود ارادیت اور احترام انسانیت جیسی اعلیٰ اخلاقی اقدار کا داعی ہے، لیکن اگر ان کی زد میں اس کے اپنے مفادات آ جائیں تو ان کا خون کرنے میں بھی اسے کوئی قباحت محسوس نہیں ہوتی۔ وہ اقوام عالم کے مابین اشتعال کو ناپسند کرتا ہے، لیکن اگر وہ خود مشتعل ہو جائے تو دوسری قوموں کے لیے اس کی زبان اور ہاتھ کے شر سے محفوظ رہنا مشکل ہو جاتا ہے۔

امریکہ کے بارے میں یہ سب باتیں درست ہیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی امر واقعی ہے کہ دنیا کی عنان اقتدار اسی کے ہاتھ میں ہے۔ فوجی قوت کے لحاظ سے اس کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ اقتصادی ضرورتوں کے لیے قومیں اسی کی طرف رجوع کرتی ہیں۔ اکثر ممالک کے بجٹ اسی کی خیرات اور قرضوں سے تشکیل پاتے ہیں۔ سیاسی اختلافات کے حل کے لیے اقوام عالم کی نظریں اسی کی طرف اٹھتی ہیں اور بین الاقوامی معاملات میں بالعموم اسی کی منشا نافذ العمل ہوتی ہے۔ باہمی تنازعات میں اسی کو ثالث مانا جاتا ہے۔ اسی کی تہذیب اور اسی کی اقدار تک رسائی کو قومیں اپنی ترقی کی معراج تصور کر رہی ہیں۔ جدید علوم و فنون کے میدان میں دنیا کی ترقی یافتہ اقوام بھی ابھی اس سے صدیوں پیچھے ہیں۔ یہی صورت حال ہے جس کی وجہ سے دنیا کے طاقت ور ممالک بھی اس کے اقتدار کو چیلنج کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اس صورت حال میں اگر مسلمان امریکہ پر اپنی برتری قائم کرنا چاہتے ہیں تو یہ لازم ہے کہ وہ اعلیٰ اخلاقیات اور سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں امریکہ سے برتر مقام پر فائز ہو جائیں تاکہ اقوام عالم کی نگاہیں امریکہ کے بجائے ان کی طرف اٹھنی شروع ہو جائیں۔ اس مقصد کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ مسلمانوں کی تمام ریاستوں میں آمرانہ حکومتوں کے بجائے جمہوری حکومتیں قائم ہوں اور دنیا پر یہ واضح ہو کہ مسلمان پروردگار عالم کی ہدایت 'امرھم شوریٰ بینھم' پر پوری طرح کاربند ہیں۔ وہ دنیا میں عدل و انصاف کے سب سے بڑے علم بردار بن کر سامنے آئیں۔ دنیا کو معلوم ہو کہ عدل پر مبنی فیصلے کی زد اگر ان کے اپنے وجود پر بھی پڑے گی تو وہ اس موقع پر بھی عدل ہی کے طرف دار ہوں گے۔ وہ مذہبی، وطنی اور لسانی تعلق سے بالاتر ہو کر محض انسانی بنیادوں پر مظلوم اور مجبور کی حمایت کرتے ہوئے نظر آئیں۔ دنیا یہ جان لے کہ اگر مظلوم و بے کس کوئی ہندو، کوئی عیسائی اور کوئی یہودی بھی ہو گا تو اس کے حق میں سب سے پہلی آواز اہل اسلام میں سے بلند ہو گی۔ مزید براں سائنس، ٹیکنالوجی اور اسلحہ کی قوت میں وہ اپنے آپ کو اس مقام پر لے آئیں کہ امریکہ، برطانیہ، روس، چین، جاپان، جرمنی اور فرانس جیسی طاقتیں بھی ان کے سامنے دست طلب دراز کریں۔

تیسری بات بھی صحیح ہے کہ اللہ کی مدد ان لوگوں کے شامل حال ہوتی ہے جو ظلم و عدوان کے خلاف برسر جنگ ہوتے اور راہ جہاد میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ اور یہ بات بھی صحیح ہے کہ ہماری تاریخ میں خالد بن ولید، طارق بن زیاد، موسیٰ بن نصیر، صلاح الدین ایوبی اور محمد بن قاسم جیسے جرنیلوں نے فتوحات کی عظیم داستانیں رقم کی ہیں۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ گزشتہ تین صدیوں کے دوران میں مسلمان جہاد کے پورے جذبے کے باوجود غیر مسلموں

ہی کے ہاتھوں شکست سے دوچار ہوئے ہیں۔ سراج الدولہ اور ٹیپو سلطان جیسے بہادروں کی انگریزوں سے شکست، سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید جیسے اصحاب ایمان کی سکھوں کے مقابلے میں ہزیمت، مسلمانان ہند کی اپنی ہی سرزمین پر جنگ آزادی میں ناکامی، عراق کی کویت پر حملے کے بعد امریکی تاخت کی وجہ سے پسپائی، فلسطین اور کشمیر میں نصف صدی سے جاری آزادی کی تحریکوں کی بے ثمری اور طالبان اور افغانستان کی امریکہ کے ہاتھوں تباہی سے صرف نظر کسی صاحب بصیرت کے لیے ممکن نہیں ہے۔

اس تناظر میں ہمارے نزدیک مسلمانوں کے لیے اس حقیقت کا ادراک ناگزیر ہے کہ نصرت الٰہی کا معاملہ الل ٹپ نہیں ہے۔ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ کا ایک قانون ہے جس کی پیروی کے بعد ہی اللہ کی مدد کی توقع کی جا سکتی ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

''اے نبی، مسلمانوں کو جہاد پر ابھارو۔ اگر تمھارے بیس ثابت قدم ہوں گے تو دو سو پر غلبہ پالیں گے اور اگر سو ایسے ہوں گے تو ان کافروں کے ہزار پر بھاری رہیں گے، اس لیے کہ یہ بصیرت نہیں رکھتے۔ اچھا، اب اللہ نے تمھارا بوجھ ہلکا کر دیا ہے اور جان لیا ہے کہ تم میں کمزوری آ گئی ہے۔ لہٰذا اگر تمھارے سو ثابت قدم ہوں گے تو دو سو پر غلبہ پائیں گے اور اگر ہزار ایسے ہوں گے تو اللہ کے حکم سے دو ہزار پر بھاری رہیں گے، اور (حقیقت یہ ہے کہ) اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو (اس کی راہ میں) ثابت قدم رہیں۔'' (الانفال ۸: ۶۵-۶۶)

ان آیات سے یہ باتیں واضح ہوتی ہیں:

اولاً، مسلمانوں کی کوئی جماعت اس وقت تک نصرت الٰہی کی مستحق نہیں قرار پاتی، جب تک اس کے اندر ثابت قدمی نہ ہو۔

ثانیاً، مسلمانوں کو چاہیے کہ جنگ کے لیے ضروری اسباب و وسائل ہر حال میں فراہم کریں اور محض جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی اقدام نہ کریں۔

ثالثاً، مسلمانوں کی قوت دشمن کے مقابلے میں کم سے کم ایک نسبت دو کی ہونی چاہیے۔ قوت کے لحاظ سے یہ تناسب اصلاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کی جماعت کے لیے بیان ہوا ہے۔ اس کے پورا ہو جانے کے بعد ان کے لیے نصرت الٰہی کی حیثیت وعدۂ خداوندی کی تھی جسے ہر حال میں پورا ہونا تھا، مگر بعد کے مسلمانوں کے لیے اس کی حیثیت یہ ہے کہ وہ ایک اور دو کا تناسب حاصل کر لینے کے بعد اللہ سے یہ توقع قائم کر سکتے ہیں کہ وہ اپنی نصرت کے دروازے ان پر کھول دے گا۔

_____ منظور الحسن

---

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورة البقرة

(۵۱)

(گزشتہ سے پیوستہ)

حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ. ﴿۲۳۸﴾ فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ. ﴿۲۳۹﴾

(یہ خدا کی شریعت ہے۔ اِس پر قائم رہنا چاہتے ہو تو) اپنی نمازوں کی حفاظت کرو،[۶۲۳] بالخصوص اُس نماز کی جو (دن اور رات کی نمازوں کے) درمیان میں آتی ہے،[۶۲۴] (جب تمھارے لیے اپنی مصروفیتوں سے نکلنا آسان نہیں ہوتا)، اور (سب کچھ چھوڑ کر) اللہ کے حضور میں نہایت ادب کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ۔ پھر اگر خطرے کا موقع ہو تو پیدل یا سواری پر، جس طرح چاہے پڑھ لو۔ لیکن جب امن ہو جائے تو اللہ کو اُسی طریقے[۶۲۵] سے یاد کرو،[۶۲۶] جو اُس نے تمھیں سکھایا ہے، جسے تم نہیں جانتے تھے۔[۶۲۷] ۲۳۸۔ ۲۳۹

[۶۲۳] یعنی ہر طرح کی مشکلات اور پر خطر حالات میں بھی اس کی حفاظت کی جائے۔ اس میں، ظاہر ہے کہ اُن تمام چیزوں کی نگہداشت اور ان کا اہتمام بھی شامل ہے جو نماز کے شرائط و ارکان یا اس کے آداب سے تعلق رکھتی ہیں اور اس طرح کی صورت حال میں لوگ بالعموم ان سے بے پروا ہو جاتے ہیں۔

[۶۲۴] اس سے مراد ہے عصر کی نماز۔ یہ ان حالات کی رعایت سے فرمایا ہے جن میں قرآن نازل ہوا۔ تمدن کی تبدیلی یا حالات کے تغیر سے یہی صورت اگر کسی اور نماز کی ہو جائے تو اس کا حکم بھی یہی ہو گا۔

[۶۲۵] یعنی نماز کا وہ طریقہ جو انبیا علیہم السلام کی تعلیم سے انسان نے سیکھا ہے۔ دین ابراہیمی کے پیرو رسول اللہ صلی اللہ

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.org

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَ يَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعاً اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ . ﴿٢٤٠﴾

اور[٦٢٨] (ہاں، بیوہ اور مطلقہ کے بارے میں جو ہدایات تمھیں دی گئی ہیں، اُن سے متعلق یہ وضاحت ضروری ہے کہ) تم میں سے جو لوگ وفات پائیں اور اپنے پیچھے بیویاں چھوڑ رہے ہوں، وہ اپنی اُن بیویوں کے لیے سال بھر کے نان ونفقہ کی وصیت کر جائیں اور یہ بھی کہ (اِس عرصے میں) اُنھیں گھر سے نہ نکالا جائے۔[٦٢٩] لیکن وہ خود گھر چھوڑ دیں تو جو کچھ دستور کے مطابق وہ اپنے معاملے میں کریں، اُس کا تم پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ (یہ اللہ کا قانون ہے) اور (جان لو کہ) اللہ زبردست ہے[٦٣٠]، وہ بڑی حکمت والا ہے[٦٣١]۔ ٢٤٠

علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے بھی اس طریقے سے واقف تھے اور ان کے صالحین اس کے مطابق نماز ادا کرتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اصلاح وتجدید فرمائی اور اسے ایک سنت کی حیثیت سے پورے اہتمام کے ساتھ اپنے ماننے والوں میں جاری کر دیا۔ یہاں امی عربوں کو خاص طور پر توجہ دلائی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کے ذریعے سے اس نوعیت کی جو تعلیم انھیں دی ہے، یہ اس کا ان پر بہت بڑا کرم ہے۔ اس کا جواب ان کی طرف سے یہی زیبا ہے کہ وہ اس کی قدر کریں، بنی اسرائیل کی طرح اس کی ناقدری نہ کریں۔

[٦٢٦] نماز کی اصل حقیقت اللہ کی یاد ہی ہے۔ یہ قرآن نے نہایت خوبی کے ساتھ اس کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔

[٦٢٧] سورہ کی تیسری فصل یہاں ختم ہو رہی ہے۔ یہ احکام شریعت کی فصل تھی جسے اللہ تعالیٰ نے نماز کی تاکید پر ختم کیا ہے۔ اس سے جس بات کی طرف اشارہ مقصود ہے، وہ یہ ہے کہ دین میں جو اہمیت نماز کی ہے، وہ کسی دوسری چیز کی نہیں ہے۔ انسان کے علم وعمل میں دین کی حفاظت اسی سے ہوتی ہے۔ اگر کوئی شخص اسے ضائع کر دیتا ہے تو گویا سارے دین کو ضائع کر دیتا ہے۔

[٦٢٨] یہ دونوں آیتیں خاتمۂ فصل کے ساتھ بطور تتمہ ملحق کر دی گئی ہیں تاکہ سورہ میں ان کے مقام ہی سے واضح ہو جائے کہ اصل احکام کے بعد یہ ان کی وضاحت کے لیے نازل ہوئی ہیں۔ چنانچہ آخر میں 'کذلك یبین اللّٰه لکم آیته' کے الفاظ سے اس طرف اشارہ بھی فرما دیا ہے۔

[٦٢٩] اصل الفاظ ہیں: 'وصیة لازواجهم متاعاً الی الحول غیر اخراج'۔ ان میں 'وصیة' فعل محذوف

وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ. ﴿۲۴۱﴾
كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ. ﴿۲۴۲﴾

اور (اِسی طرح یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ) مطلقہ عورتوں کو ہر حال میں دستور کے مطابق کچھ سامانِ زندگی دے کر رخصت کرنا چاہیے۔ یہ حق ہے اُن پر جو خدا سے ڈرنے والے ہوں[۶۳۲]۔ ۲۴۱
اللہ اِسی طرح تمھارے لیے اپنی آیتوں کی وضاحت کرتا ہے تاکہ تم سمجھنے والے بنو[۶۳۳]۔ ۲۴۲

کا مفعول ہے۔ 'متاعاً' 'وصیۃ' کا مفعول ہے اور 'غیر اخراج' 'لازواجھم' سے حال واقع ہوا ہے۔ اس جملے کی یہی تالیف ہمارے نزدیک صحیح ہے۔ عام طور پر لوگ اس حکم کو سورۂ نساء میں تقسیم وراثت کی آیات سے منسوخ مانتے ہیں، لیکن صاف واضح ہے کہ عورت کو نان ونفقہ اور سکونت فراہم کرنے کی جو ذمہ داری شوہر پر اس کی زندگی میں عائد ہوتی ہے، یہ اسی کی توسیع ہے۔ عدت کی پابندی وہ شوہر ہی کے لیے قبول کرتی ہے۔ پھر اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے لیے بھی اسے کچھ مہلت لازماً ملنی چاہیے۔ یہ حکم ان مصلحتوں کے پیش نظر دیا گیا ہے۔ تقسیم وراثت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

[۶۳۰] لہٰذا کسی کو اس کے قانون کی خلاف ورزی کی جسارت نہیں کرنی چاہیے۔

[۶۳۱] اس لیے ہر شخص کو سمجھنا چاہیے کہ اس نے جو احکام بھی دیے ہیں، ان میں انھی کے مصالح پیش نظر ہیں۔

[۶۳۲] اس سے واضح ہے کہ یہ ایک حق واجب ہے۔ اگر کوئی شخص اسے ادا نہیں کرتا تو تقویٰ اور احسان کی صفات پر مبنی ہونے کی وجہ سے قانون چاہے اس پر گرفت نہ کر سکے، لیکن اللہ کے ہاں وہ یقیناً اس پر ماخوذ ہو گا اور آخرت میں اس کے ایمان واحسان کا وزن اسی کے لحاظ سے متعین کیا جائے گا۔

[۶۳۳] یہ اجمال کے بعد تفصیل اور توضیح کے بعد توضیح مزید کا جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے، استاذ امام اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

"... اس سے دین میں غور وفکر اور اس کے فوائد ومصالح اور اس کے اسرار وحکم تک پہنچنے کے لیے ہماری عقل کی تربیت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس تدریج کو نمایاں کر کے اس حقیقت کی طرف ہماری رہنمائی فرماتا ہے کہ ہم دین میں عقل کو کس طرح استعمال کر سکتے ہیں اور پیش آنے والے حالات ومعاملات میں ان کلیات سے کس طرح جزئیات مستنبط کر سکتے ہیں۔ اسی حقیقت کی طرف 'لعلکم تعقلون' کے الفاظ اشارہ کر رہے ہیں۔" (تدبر قرآن ۱/ ۵۵۷)

[باقی]

---

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اسلام میں بہترین بات اور انسان کے لیے خطرے کی چیز

[اس روایت کی ترتیب و تدوین اور شرح و وضاحت جناب جاوید احمد غامدی کی رہنمائی میں ان کے رفقا معز امجد، منظور الحسن، محمد اسلم نجمی اور کوکب شہزاد نے کی ہے۔]

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

روى[1] انه قال رجل من الصحابة لرسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم : يا رسول اللّٰه قل لى فى الاسلام قولا[2] لا اسال عنه احدا بعدك[3]. قال: قل امنت باللّٰه فاستقم[4].

قال : يا رسول اللّٰه ما اكثر ما تخاف على[5]؟ فاخذ رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم بلسان نفسه ثم قال هذا[6].

روایت ہے کہ صحابۂ کرام میں سے کسی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا: یا رسول اللہ، اسلام کے بارے میں مجھے کوئی ایسی بات ارشاد فرمائیے کہ آپ کے بعد مجھے کسی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت باقی نہ رہے۔ آپ نے فرمایا: اس بات کا اقرار کرو کہ میں اللہ پر ایمان لایا اور پھر اس پر قائم رہو[1]۔

اس نے پوچھا: یا رسول اللہ، میرے لیے سب سے زیادہ خطرے کی چیز کیا ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: یہ۔

ترجمے کے حواشی

۱۔ تمام صالح اعمال درحقیقت ایمان باللہ ہی کی فرع ہیں۔ یہ ایمان اگر دل میں جاگزیں ہو تو انسان اپنے پروردگار کی رضا کا طلب گار بنتا اور دین و شریعت کے مطالبات پر عمل پیرا ہونے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔

متن کے حواشی

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

۱۔ اپنی اصل کے اعتبار سے یہ مسلم کی روایت رقم ۳۸ ہے۔ معمولی اختلاف کے ساتھ یہ حسب ذیل مقامات پر نقل ہوئی ہے:

مسلم، رقم ۳۸۔ ابن ماجہ، رقم ۳۹۷۲۔ ترمذی، رقم ۲۴۱۰۔ احمد بن حنبل، رقم ۱۵۴۵۴، ۱۵۴۵۵، ۱۵۴۵۶، ۱۵۴۵۷، ۱۹۴۵۰۔ دارمی، رقم ۲۷۱۰، ۲۷۱۱۔ ابن حبان، رقم ۹۴۲، ۵۶۹۸، ۵۶۹۹، ۵۷۰۰، ۵۷۰۲۔ نسائی سنن الکبریٰ، رقم ۱۱۴۸۹۔ ابن ابی شیبہ، رقم ۲۶۵۰۱۔

۲۔ بعض روایات مثلاً ابن ماجہ، رقم ۳۹۷۲ میں 'قل لی فی الاسلام قولا' (اسلام کے بارے میں مجھے ایسی بات ارشاد فرمایئے) کی جگہ 'حدثنی بامر اعتصم به' (مجھے ایسی بات ارشاد فرمایئے جس پر میں ہمیشہ قائم رہوں) کے الفاظ آئے ہیں۔

۳۔ بعض راویوں نے 'بعدك' (آپ کے بعد) کے بجائے 'غیرك' (آپ کے علاوہ) کے الفاظ روایت کیے ہیں۔

۴۔ بعض روایات مثلاً ابن ماجہ، رقم ۳۹۷۲ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب ان الفاظ میں نقل ہوا ہے: 'قل ربی اللّٰه ثم استقم' (کہو، میرا پروردگار اللہ ہے اور پھر اس پر قائم رہو)۔

۵۔ بعض طرق مثلاً احمد ابن حنبل، رقم ۱۵۴۵۵ میں 'ما اکثر ما تخاف علی' (میرے لیے سب سے زیادہ خطرے کی چیز کیا ہے؟) کی جگہ 'فای شیء اتقی' (مجھے کس چیز سے بچے رہنا چاہیے؟) کے الفاظ آئے ہیں۔

۶۔ روایت کا یہ آخری حصہ ابن ماجہ، رقم ۳۹۷۲ سے لیا گیا ہے۔

جاوید احمد غامدی

قانون دعوت

یہ ''میزان'' کا ایک باب ہے۔نئی طباعت کے لیے مصنف نے اس میں بعض اہم ترامیم کی ہیں۔ یہ ترامیم مضمون کے جس حصے میں کی گئی ہیں، اسے ہم یہاں شائع کر رہے ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

دین کا ایک اہم مطالبہ یہ ہے کہ جو لوگ اس دنیا میں حق کو اختیار کریں، وہ اسے اختیار کر لینے کے بعد دوسروں کو بھی برابر اس کی تلقین و نصیحت کرتے رہیں۔ دین کا یہی مطالبہ ہے جس کے لیے بالعموم دعوت و تبلیغ کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ ہم مسلمان اس حقیقت سے ہمیشہ واقف رہے ہیں کہ ایمان و عملِ صالح کی جو روشنی اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا کی ہے، اس کا یہ حق ہم پر عائد ہوتا ہے کہ ہم دوسروں کو بھی اس سے محروم نہ رہنے دیں۔ اس کام کی یہی اہمیت ہے جس کے پیشِ نظر اللہ تعالیٰ نے جہاں عبادات، سیاست، معیشت اور بعض دوسرے معاملات میں اپنی شریعت انسانوں کو دی ہے، وہاں دعوت کے لیے بھی ایک مفصل قانون اس شریعت میں واضح فرمایا ہے۔ اس قانون کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں دعوت کی ذمہ داری اہل ایمان کی مختلف حیثیتوں کے لحاظ سے بالکل الگ الگ صورتوں میں ان پر عائد کی گئی ہے۔ تفہیم مدعا کے لیے ہم اس قانون کو درج ذیل عنوانات کے تحت بیان کر سکتے ہیں:

پیغمبر کی دعوت

ذریت ابراہیم کی دعوت

علما کی دعوت

ریاست کی دعوت

فرد کی دعوت

ذیل میں ہم انھی عنوانات کے تحت اس باب میں قرآنِ مجید کے نصوص کی وضاحت کریں گے۔

پیغمبر کی دعوت

یٰٓاَیُّھَاالنَّبِیُّ ، اِنَّآ اَرْسَلْنٰکَ شَاھِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِیْراً، وَّدَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجاً مُّنِیْرًا .

(الاحزاب ۳۳: ۴۵-۴۶)

''اے پیغمبر، ہم نے تمھیں گواہی دینے والا اور خوش خبری پہنچانے والا اور انذار کرنے والا اور اللہ کے اذن سے اُس کی طرف دعوت دینے والا اور انسانوں کی ہدایت کے لیے ایک روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے۔''

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا منصب دعوت ہے جس کی وضاحت اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں پوری تفصیل کے ساتھ کر دی ہے۔ اللہ کے جو پیغمبر بھی اس دنیا میں آئے، قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی دعوت الی اللہ اور انذار و بشارت کے لیے آئے۔ سورۂ بقرہ کی آیت 'کان الناس امة واحدة فبعث اللّٰه النبيين مبشرين و منذرين[1]'، میں یہی بات بیان ہوئی ہے۔ ان نبیوں میں سے اللہ تعالیٰ نے جنھیں رسالت کے منصب پر فائز کیا، ان کے بارے میں البتہ، قرآن بتاتا ہے کہ وہ اس انذار کو اپنی قوموں پر شہادت کے مقام تک پہنچا دینے کے لیے بھی مامور تھے۔ قرآن کی اصطلاح میں اس کے معنی یہ ہیں کہ حق لوگوں پر اس طرح واضح کر دیا جائے کہ اس کے بعد کسی شخص کے لیے اس سے انحراف کی گنجایش نہ ہو: 'لئلا یکون للناس علی اللّٰه حجة بعد الرسل[2]' (تاکہ رسولوں کے بعد لوگوں کے لیے اللہ کے سامنے کوئی عذر پیش کرنے کے لیے باقی نہ رہے)۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان رسولوں کو اپنی دینونت کے ظہور کے لیے منتخب فرماتے اور پھر قیامت سے پہلے ایک قیامت صغریٰ ان کے ذریعے سے اسی دنیا میں برپا کر دیتے ہیں۔ انھیں بتا دیا جاتا ہے کہ وہ خدا کے ساتھ اپنے میثاق پر قائم رہیں گے تو اس کی جزا اور اس سے انحراف کریں گے تو اس کی سزا انھیں دنیا ہی میں مل جائے گی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان کا وجود لوگوں کے لیے ایک آیت الٰہی بن جاتا ہے اور وہ خدا کو گویا ان کے ساتھ زمین پر چلتے پھرتے اور عدالت کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ یہی شہادت ہے۔ یہ جب قائم ہو جاتی ہے تو جن کے ذریعے سے قائم ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ انھیں غلبہ عطا فرماتے اور ان کی دعوت کے منکرین پر اپنا عذاب نازل کر دیتے ہیں۔ سورۂ احزاب کی ان آیات میں 'شاھداً' کا لفظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی منصب کو بیان کرنے کے لیے آیا ہے۔ نبیوں کا انذار و بشارت تو کسی وضاحت کا تقاضا نہیں کرتا

---

[1] ۲: ۲۱۳، ''لوگ ایک ہی جماعت تھے، (انھوں نے اختلاف کیا) تو اللہ نے نبی بھیجے، بشارت دیتے اور انذار کرتے ہوئے۔''

[2] النساء ۴: ۱۶۵۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

لیکن رسولوں کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ انذار و بشارت کے ساتھ وہ شہادت کی جس ذمہ داری کے لیے مامور ہوتے ہیں، اس کے تقاضے سے ان کی دعوت کے چند مراحل اور ان مراحل کے چند لازمی نتائج ہیں جو انھی کے ساتھ خاص ہیں۔ یہ دعوت کی کسی دوسری صورت سے متعلق نہیں ہیں۔ رسولوں کی دعوت کے یہی مراحل ہم تفصیل کے ساتھ یہاں بیان کریں گے۔

انذار

یہ اس دعوت کا پہلا مرحلہ ہے۔ ''انذار'' کے معنی کسی برے نتیجے سے لوگوں کو خبردار کرنے کے ہیں۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے رسول اپنی قوم کو ہمیشہ دو عذابوں سے خبردار کرتے رہے ہیں: ایک وہ جس سے اُن کے منکرین قیامت میں دوچار ہوں گے اور دوسرا وہ جو ان کی دعوت کے مقابلے میں سرکشی اختیار کرنے والوں پر اسی دنیا میں نازل ہوگا۔ وہ اپنی قوم کو بتاتے ہیں کہ وہ زمین پر ایک قیامتِ صغریٰ برپا کر دینے کے لیے مبعوث ہوئے ہیں۔ خدا کی حجت جب ان کی دعوت سے پوری ہو جائے گی تو اُن کی قوم کو اپنی سرکشی کا نتیجہ لازماً اسی دنیا میں دیکھنا ہوگا۔ قرآن کے چھٹے باب میں سورۂ قمر اس انذار کی بہترین مثال ہے۔ اس میں رسولوں سے متعلق اپنی سنت کا حوالہ دے کر اللہ تعالیٰ نے بڑی تہدید کے اسلوب میں فرمایا ہے کہ: 'اکفارکم خیر من اولئکم ام لکم برأۃ فی الذبر'[۳] (کیا تمھارے یہ منکر اُن سے کچھ بہتر ہیں یا ان کے لیے صحیفوں میں کوئی معافی لکھی ہوئی ہے)؟ قرآن کے آخری باب میں الملک (۶۷) سے الجن (۷۲) تک چھ سورتیں، خود قرآن کے نظم ہی سے پوری قطعیت کے ساتھ واضح ہو جاتا ہے کہ اسی مرحلے کی سورتیں ہیں۔ ان سورتوں کے مطالعے سے قرآن کا ہر طالب علم اس لب و لہجے، اسلوب اور طرزِ استدلال کا اندازہ کر سکتا ہے جو اللہ کے رسول اس مرحلے میں اختیار کرتے ہیں۔ سورۂ قلم میں باغ والوں کی تمثیل بیان کر کے قرآن نے اس انذار کا خلاصہ اس طرح بیان فرمایا ہے:

كَـذٰلِكَ الْـعَذَابُ، وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ، لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ. (۶۸:۳۳)

''(ام القریٰ کے لوگو، تم اس پیغمبر کو جھٹلا رہے ہو تو دیکھ لو) اس طرح آئے گا عذاب اور آخرت کا عذاب تو اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اے کاش، یہ لوگ اس کو جانتے۔''

اس انذار کو چونکہ اس دنیا میں لازماً ایک حتمی نتیجے تک پہنچنا ہوتا ہے، اس لیے اس میں اصلاً انھی لوگوں کو مخاطب کیا جاتا ہے جو کسی نہ کسی پہلو سے اپنی قوم میں اثر و رسوخ رکھتے ہوں؛ عوام اپنے علم و عمل اور سیرت و اخلاق میں جن کے تابع ہوں؛ جن کی بیماری دوسروں کے لیے بیماری اور تندرستی تندرستی کا باعث بنتی ہو؛ جن کے دل و دماغ کا مفتوح ہو جانا سب کے مفتوح ہو جانے کا ذریعہ ہو؛ جن کے پاس مادی ذرائع و وسائل کی افراط حق کی قوت میں اضافہ کر سکے؛ جو اپنی ذہنی رفعت سے دعوت کو علم و عمل کی بے پناہ قوتوں کا سیلاب بنا دینے کی صلاحیت رکھتے ہوں اور عوام جن کی دلیلوں کے تار و پود بکھرتے، جن کے فکر و

۳ے ۵۴:۴۳۔

فلسفہ کی جڑیں اکھڑتی اور جن کے نظامِ اخلاق وسیاست کے فلک بوس محلوں کی بنیادیں جب تک اپنی آنکھوں سے متزلزل ہوتے نہ دیکھ لیں، اس وقت تک نہ دعوت حق کے لیے پوری طرح یک سو ہو سکتے ہوں، نہ پرانے معتقدات کے گرداب سے نکل سکتے ہوں، نہ ان کے بارے میں تذبذب سے نجات پا سکتے ہوں اور نہ کسی دعوت کی حمایت میں وہ ذہنی رفعت محسوس کر سکتے ہوں جس سے حوصلہ پا کر بدر وحنین کے مجاہدوں کی طرح وہ ان صنادید کی قوت وعظمت کا طلسم توڑ دیں۔

قرآنِ مجید سے پیغمبروں کے انذار کی یہ خصوصیت جس طرح سامنے آتی ہے، اس کی وضاحت میں استاذ امام امین احسن اصلاحی اپنی کتاب ''دعوت دین اور اس کا طریق کار'' میں لکھتے ہیں:

''حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سب سے پہلے خود اپنے اس خاندان کو دعوت دی جو قوم کی مذہبی پیشوائی کی مسند پر متمکن تھا۔ پھر اس بادشاہ کو دعوت دی جس کے ہاتھوں میں سیاسی اقتدار کی باگ تھی اور جو اپنے آپ کو لوگوں کی زندگی اور موت کا مالک سمجھے ہوئے بیٹھا تھا... حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ سب سے پہلے فرعون کو مخاطب کریں... حضرت مسیح علیہ السلام نے سب سے پہلے علماے یہود کو دعوت دی۔ اسی طرح حضرات نوح علیہ السلام، ہود علیہ السلام، شعیب علیہ السلام، سب کی دعوتیں قرآنِ مجید میں مذکور ہیں۔ ان میں سے ہر نبی نے سب سے پہلے اپنے وقت کے اربابِ اقتدار اور متکبرین کو جھنجھوڑا اور ان کے افکار ونظریات پر ضرب لگائی۔ سب سے آخر میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی اور آپ کو حکم ہوا کہ اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈراؤ۔ یہ لوگ عرب کی مذہبی اور پدرسرانہ (Patriarchal) حکومت کے اربابِ حل وعقد تھے اور اس کے واسطے سے سارے عرب کی اخلاقی اور سیاسی رہنمائی کر رہے تھے۔'' (۴۹۔۵۰)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَ کَذٰلِکَ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰی وَ مَنْ حَوْلَھَا وَ تُنْذِرَ یَوْمَ الْجَمْعِ، لَا رَیْبَ فِیْہِ، فَرِیْقٌ فِی الْجَنَّةِ وَ فَرِیْقٌ فِی السَّعِیْرِ. (الشوریٰ ۴۲: ۷)

''اور اسی طرح ہم نے تم پر یہ قرآنِ عربی وحی کیا ہے کہ تم ام القریٰ اور اس کے گردوپیش میں بسنے والوں کو خبردار کر دو اور اُس روزِ محشر سے خبردار کر دو جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں، جہاں ایک جماعت کو جنت میں جانا ہے اور ایک کو جہنم میں۔''

انذار عام

یہ دوسرا مرحلہ ہے۔ اس میں اور مرحلۂ انذار میں اس کے سوا کوئی فرق نہیں ہے کہ اُس میں دعوت فرداً فرداً یا نجی کی بعض مجالس ہی میں پیش کی جاتی ہے، لیکن اِس مرحلے میں پیغمبر کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ کھلم کھلا اپنی قوم کو پکارنے کے لیے اٹھے اور جس حد تک اور جن ذرائع سے بھی ممکن ہو اپنی دعوت ہانکے پکارے ان کے سامنے رکھ دے۔ پیغمبروں کی دعوت میں یہ مرحلہ

بڑا ہی سخت ہوتا ہے۔ قرآن نے بتایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت میں جب یہ مرحلہ آیا تو اس کی تیاریوں کے لیے آپ کو قیام اللیل کا حکم دیا گیا۔ قرآن کی سورۂ مزمل اسی موقع پر نازل ہوئی ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو رات کی نماز کے لیے اٹھنے، اس میں ٹھیرٹھیر کر قرآن پڑھنے، اپنے پروردگار کی صفات پر متنبہ ہو کر اپنے دل کو اس کی یاد سے معمور اور زبان کو اس کی تسبیح و تحمید سے تر رکھنے اور رات کی تنہائی میں سب سے ٹوٹ کر اسی کے ساتھ لو لگانے کی ہدایت کی اور فرمایا کہ یہ ہدایت ہم اس لیے کر رہے ہیں کہ 'انا سنلقی علیك قولاً ثقیلاً' (عنقریب ایک بھاری بات کا بوجھ ہم تم پر ڈال دیں گے)۔ چنانچہ اس کے بعد کی سورہ میں یہ بوجھ آپ پر ڈال دیا گیا اور ارشاد ہوا:

يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ، قُمْ فَاَنْذِرْ، وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ، وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ، وَالرُّجْزَفَاهْجُرْ، وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ، وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ۔ (المدثر ۷۴: ۱۔۷)

''اے اوڑھ لپیٹ کر بیٹھنے والے، اٹھو اور انذار عام کے لیے کھڑے ہو جاؤ اور اپنے پروردگار ہی کی بڑائی بیان کرو اور اپنے دامن دل کو پاک رکھو اور شرک کی اِس غلاظت سے دور رہو اور دیکھو اپنی سعی کو زیادہ خیال کر کے منقطع نہ کر بیٹھو اور اپنے پروردگار کے فیصلے کے انتظار میں ثابت قدم رہو۔''

دعوت کی ترتیب اس مرحلے میں بھی وہی رہتی ہے اور اصلاً قوم کے پیشوا اور ارباب حل وعقد ہی پیغمبر کے مخاطب ہوتے ہیں، لیکن انذارِ عام کی شدت اس ردعمل کو بھی پوری قوت سے سامنے لے آتی ہے جو مرحلۂ انذار میں اس طرح نمایاں نہیں ہوتا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جو لوگ سب سے پہلے ایمان لائے، وہ چونکہ زیادہ تر نوجوان تھے، اس لیے یہ ردِعمل بھی اولاً اُن کے اعزہ و احباب اور متعلقین کی طرف سے ظاہر ہوا۔ قوم کے زعما اُس وقت میدان میں آئے، جب انھوں نے دیکھا کہ پیغمبر کی دعوت اب معاشرے میں موثر ہو رہی ہے۔ پھر انھوں نے جو کچھ کیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس موقع پر جو رویہ اختیار کرنے کی ہدایت ہوئی، وہ اس مرحلے کی سورتوں میں جگہ جگہ بیان ہوا ہے۔ سورۂ یونس کے ان دو مقامات سے اس کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے، فرمایا ہے:

وَاِذَا تُتْلٰی عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا: ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ، قُلْ: مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ، اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ، اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ. (یونس ۱۰: ۱۵)

''اور جب ہماری آیتیں ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں، نہایت صاف تو وہ لوگ جو ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے، کہتے ہیں کہ اس کے بجائے کوئی اور قرآن لاؤ یا اس میں کچھ ترمیم کرو۔ ان سے کہہ دو: یہ میرا کام نہیں ہے کہ میں اپنی طرف سے اس میں ترمیم کر دوں۔ میں تو بس اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے پاس آتی ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

میں نے اگر اپنے پروردگار کی نافرمانی کی تو میں ایک بڑے ہول ناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔''

قُلْ: يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ فَلَاۤ اَعْبُدُ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ، وَلٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ، وَ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ، وَاَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا، وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ. (یونس ۱۰: ۱۰۴۔۱۰۵)

''ان سے کہہ دو: اے لوگو، اگر تم میرے دین کے بارے میں کسی تردد میں مبتلا ہو تو سن لو کہ تم اللہ کے سوا جن کی عبادت کرتے ہو، میں ان کی عبادت نہیں کرتا، بلکہ اس اللہ کی عبادت کرتا ہوں جو تمھیں وفات دیتا ہے اور مجھے حکم ہوا ہے کہ میں اہل ایمان میں سے ہوں اور حکم ہوا ہے کہ پوری یک سوئی کے ساتھ اپنا رخ سیدھا دین حق کی طرف کر لوں اور ہرگز ان مشرکوں میں سے نہ ہوں۔''

یہی مقام ہے جس تک پہنچنے کے بعد پھر اس مرحلے میں وہ وقت بھی آ جاتا ہے جب پیغمبر کو ان متکبرین کے بہت زیادہ درپے ہونے سے روک دیا جاتا ہے اور ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ اب اپنے ساتھیوں کی تربیت ہی کو اصلاً اپنی توجہات کا مرکز بنائے۔ قرآن میں یہ ہدایت اس طرح بیان ہوئی ہے:

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

فَتَوَلَّ عَنْهُمْ فَمَاۤ اَنْتَ بِمَلُوْمٍ، وَّ ذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ. (الذاریات ۵۱: ۵۴۔۵۵)

''اس لیے اب تم ان سے اعراض کرو۔ اب تم پر کوئی الزام نہیں اور یاددہانی کرتے رہو، کیونکہ یاددہانی اہلِ ایمان کو نفع دیتی ہے۔''

عَبَسَ وَ تَوَلّٰۤى، اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى، وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰۤى، اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى. اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى، فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى، وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى، وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى، وَهُوَ يَخْشٰى، فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى. كَلَّاۤ، اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ، فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ، فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ، مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ، بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ، كِرَامٍ بَرَرَةٍ. (عبس ۸۰: ۱۔۱۶)

''اِس نے تیوری چڑھائی اور منہ پھیر لیا (ہمارے اِس پیغمبر نے) اس پر کہ (قریش کے سرداروں کے ساتھ اس کی مجلس میں) وہ نابینا آ گیا اور تمھیں کیا معلوم، (اے پیغمبر) کہ شاید وہ (پوچھتا اور) سدھرتا یا (تم سناتے)، وہ نصیحت سنتا اور یہ نصیحت اُس کے کام آتی۔ یہ جو بے پروائی برتتے ہیں، اِن کے تو تم پیچھے پڑتے ہو، دراں حالیکہ یہ اگر نہ سدھریں تو تم پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ اور وہ جو شوق سے تمھارے پاس آتا ہے اور (خدا سے) ڈرتا بھی ہے تو اُس سے تم بے پروائی برتتے ہو۔ ہرگز نہیں، (اِن کے پیچھے پڑنے کی ہرگز ضرورت نہیں ہے)۔ یہ تو ایک یاددہانی ہے۔ سو جس کا جی چاہے، اِس سے یاددہانی حاصل کرے

(اور جس کا جی چاہے، کانوں میں انگلیاں ٹھونس لے)۔
ادب کے لائق، بلند اور اچھوتے صحیفوں میں، بہت صاحب
عزت، بہت وفادار لکھنے والوں کے ہاتھوں میں۔''

اتمام حجت

یہ تیسرا مرحلہ ہے۔ اس تک پہنچنے میں حقائق اس قدر واضح ہو جاتے ہیں کہ مخاطبین کے پاس کوئی عذر پیش کرنے کے لیے باقی نہیں رہ جاتا۔ یہی چیز ہے جسے اصطلاح میں اتمام حجت سے تعبیر کیا جاتا ہے، یعنی جو کچھ پیش کیا جارہا ہے، وہ اس طرح مبرہن ہو جائے کہ ضد، ہٹ دھرمی اور عناد کے سوا کوئی چیز بھی آدمی کو اس کے انکار پر آمادہ نہ کر سکے۔ اس میں ظاہر ہے کہ اسلوب، استدلال، کلام اور پیغمبر کی ذات وصفات اور علم وعمل میں خدا کی آیات بینات، ہر چیز موثر ہوتی ہے، یہاں تک کہ معاملہ کھلے آسمان پر چمکتے ہوئے سورج کی طرح روشن ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس موقع پر پیغمبر اپنے مخاطبین کا انجام بھی بڑی حد تک واضح کر دیتا ہے اور دعوت میں بھی بالکل آخری تنبیہ کا لب ولہجہ اختیار کر لیتا ہے۔ قرآن مجید کی سورۂ فیل اور سورۂ قریش میں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے اسی مرحلۂ اتمامِ حجت کے اختتام پر نازل ہوئی ہیں، یہ دونوں چیزیں بہت نمایاں ہیں۔ ارشاد فرمایا ہے:

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ؟ اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ ؟ وَّاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ ؟ تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ ، فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ .
(۱۰۵: ۱۔۵)

''تو نے دیکھا نہیں کہ تیرے پروردگار نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا؟ اُن کی چال کیا اُس نے اکارت نہیں کر دی؟ اور ان پر جھنڈ کے جھنڈ پرندے مسلط نہیں کر دیے؟ (اس طرح کہ) تو پکی ہوئی مٹی کے پتھر انھیں مار رہا تھا اور اُس نے انھیں کھایا ہوا بھوسا بنا دیا۔''

لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ، اِلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ، فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ، الَّذِيْ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ وَّ اٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ . (۱۰۶: ۱۔۴)

''قریش کو مانوس کر دینے کے باعث، (اور کچھ نہیں تو حرم کے سایۂ امن میں) سردی اور گرمی کے سفروں سے ان کو مانوس کر دینے ہی کے باعث، اُنھیں چاہیے کہ وہ اس گھر کے مالک کی عبادت کریں جس نے (ان بنجر پہاڑوں کی) بھوک میں اُنھیں کھلایا اور (اِن کے) خوف میں انھیں امن عطا فرمایا۔''

پہلی سورہ، اگر غور کیجیے تو قریش کو اس حقیقت پر متنبہ کرتی ہے کہ جس پروردگار نے تمھارے سامنے اپنے دشمنوں کو اس

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

طرح پامال کیا ہے، تم اس کی دشمنی کے لیے اٹھے ہو تو تمھارا انجام بھی اس سے مختلف نہ ہو گا، اور دوسری سورہ انھیں اس بات کی تلقین کرتی ہے کہ جس گھر کی تولیت انھیں حاصل ہے، یہ اُسی کا مالک ہے جس نے انھیں رزق اور امن سے نوازا ہے، لہٰذا اس کا یہ حق تو کم سے کم انھیں پہچاننا چاہیے کہ اس دنیا میں وہ اسی کے بندے بن کر رہیں۔

دعوت کے اس مرحلے میں پیغمبر کا اسلوب یہی ہوتا ہے۔

ہجرت و برأت

یہ چوتھا مرحلہ ہے۔ اللہ کے پیغمبر جب تبلیغ کا حق بالکل آخری درجے میں ادا کر دیتے ہیں اور حجت تمام ہو جاتی ہے تو یہ مرحلہ آ جاتا ہے۔ اس میں قوم کے سرداروں کی فرد قرار دادِ جرم بھی پوری وضاحت کے ساتھ انھیں سنا دی جاتی ہے اور یہ بات بھی بتا دی جاتی ہے کہ ان کا پیمانۂ عمر لبریز ہو چکا۔ لہٰذا اب ان کی جڑیں اس زمین سے لازماً کٹ جائیں گی۔ اس کے ساتھ پیغمبر کو بھی بشارت دی جاتی ہے کہ نصرتِ خداوندی کے ظہور کا وقت آ پہنچا۔ وہ اور اس کے ساتھی اب نجات پائیں گے اور جس سرزمین میں وہ کمزور اور بے بس تھے، وہاں انھیں سرفرازی حاصل ہو جائے گی۔ اس لیے اپنی قوم کی تکفیر اور اس کے عقیدہ و مذہب سے بے زاری کا اعلان کر کے وہ اب اسے چھوڑنے کے لیے تیار ہو جائیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت میں یہ سب جس طرح ہوا، وہ قرآن کی ان سورتوں سے واضح ہے:

اَرَءَ یْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ؟ فَذٰلِکَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ، وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ، فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ، الَّذِیْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ، الَّذِیْنَ هُمْ یُرَآءُوْنَ، وَیَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ.

(الماعون ۱۰۷: ۱۔۷)

’’تم نے دیکھا اسے جو روزِ جزا کو جھٹلاتا ہے، (اے پیغمبر)؟ یہ وہی تو ہے جو یتیم کو دھکے دیتا اور مسکین کو کھلانے کے لیے نہیں ابھارتا۔ اس لیے بربادی ہے (حرم کے پروہت) اِن نمازیوں کے لیے جو اپنی نمازوں (کی حقیقت) سے غافل ہیں۔ یہ جو (عبادت کی) نمایش کرتے اور برتنے کی کوئی ادنیٰ چیز بھی کسی کو دینے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔‘‘

اِنَّـآ اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ، فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَرْ، اِنَّ شَانِئَکَ هُوَ الْاَبْتَرُ. (الکوثر ۱۰۸: ۱۔۳)

’’ہم نے یہ خیر کثیر (اپنا یہ گھر) تمھیں عطا کر دیا ہے، (اے پیغمبر)۔ اِس لیے تم (اِس میں اب) اپنے پروردگار ہی کی نماز پڑھنا اور اُسی کے لیے قربانی کرنا۔ اِس میں شبہ نہیں کہ تمھارا یہ دشمن ہی جڑ کٹا ہے، اس کا کوئی نام لیوا نہ رہے گا۔‘‘

www.javedahmadghamidi.org www.al-mawrid.org

قُلْ: یٰٓاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ، لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ، وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ، وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ، وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ. لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِىَ دِيْنِ. (الکٰفرون ۱۰۹: ۱-۶)

''تم اعلان کرو، (اے پیغمبر) کہ اے کافرو، میں اُن چیزوں کی عبادت نہ کروں گا جن کی تم عبادت کرتے ہو اور نہ تم کبھی (تنہا) اُس کی عبادت کرو گے جس کی عبادت میں کرتا ہوں اور نہ اس سے پہلے کبھی میں اُن چیزوں کی عبادت کے لیے تیار ہوا جن کی عبادت تم نے کی اور نہ تم (تنہا) اُس کی عبادت کے لیے کبھی تیار ہوئے جس کی عبادت میں کرتا رہا ہوں۔ (اس لیے اب) تمھارے لیے تمھارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین۔''

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَ الْفَتْحُ، وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِىْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا، فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ، اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا۔ (النصر ۱۱۰: ۱-۳)

''اللہ کی مدد اور وہ فتح جب آ جائے (جس کا وعدہ ہم نے تم سے کیا ہے)، اور تم لوگوں کو جوق در جوق اللہ کے دین میں داخل ہوتے دیکھ لو تو اپنے پروردگار کی تسبیح کرو اُس کی حمد کے ساتھ اور اُس سے معافی چاہو۔ (اس لیے کہ) وہ بڑا ہی معاف کرنے والا ہے۔''

اس کے بعد پیغمبر کو ہجرت کا حکم دے دیا جاتا ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ہجرت کا حکم اللہ تعالیٰ ہی دیتے ہیں، اس کا فیصلہ کوئی پیغمبر اپنے اجتہاد سے نہیں کر سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی انسان کے لیے اپنی عقل و رائے سے یہ فیصلہ کر لینا کہ اس کی طرف سے حجت پوری ہو گئی اور قوم کی طرف سے دعوتِ حق کے لیے اب کسی مثبت ردِعمل کی توقع نہیں کی جا سکتی، کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ قومِ لوط کے متعلق یہ فیصلہ لے کر جب خدا کے فرشتے ابراہیم جیسے جلیل القدر پیغمبر کے پاس آئے تو انھوں نے اسے قبل از وقت سمجھا اور اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے مجادلہ کیا[۴] اور یونس علیہ السلام نے اپنی رائے سے یہ فیصلہ کر لیا تو اللہ تعالیٰ نے اس پر سخت مواخذہ کیا[۵] اور ان کے رجوع کے بعد ان کی قوم کے ایمان سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ توفیقِ ہدایت کا وقت صرف اللہ کے علم میں ہے۔ قرآنِ مجید انھی کی مثال پیش کر کے واضح کرتا ہے کہ اللہ کے پیغمبر کو اس معاملے میں پوری استقامت کے ساتھ اللہ کے فیصلے کا منتظر رہنا چاہیے۔ وہ اپنی رائے سے یہ خیال کر کے کہ اس کی طرف سے فرضِ دعوت کافی حد تک ادا ہو چکا، اپنی قوم کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ اس پر لازم ہے کہ وہ جس ذمہ داری پر مامور ہوا ہے، اس میں برابر لگا رہے۔ یہاں تک کہ اس کا پروردگار ہی یہ فیصلہ کر دے کہ حجت پوری ہو گئی، قوم کی مہلت ختم ہوئی اور اب پیغمبر انھیں چھوڑ کر جا سکتا ہے۔

۴؎ ہود ۱۱: ۷۴-۷۶۔

۵؎ الصّٰفّٰت ۳۷: ۱۳۹-۱۴۸۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

جزاوسزا

یہ آخری مرحلہ ہے۔اس میں آسمان کی عدالت زمین پر قائم ہوتی ہے،خدا کی دینونت کا ظہور ہوتا ہے اور پیغمبر کی قوم کے لیے ایک قیامت صغریٰ برپا ہو جاتی ہے۔پیغمبروں کے انذار کی جو تاریخ قرآن میں بیان ہوئی ہے،اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر بالعموم دو ہی صورتیں پیش آتی ہیں: ایک یہ کہ پیغمبر کے ساتھی بھی تعداد میں بہت کم ہوتے ہیں اور اسے کوئی دارالہجرت بھی میسر نہیں ہوتا۔دوسرے یہ کہ وہ معتد بہ تعداد میں اپنے ساتھیوں کو لے کر نکلتا ہے اور اس کے نکلنے سے پہلے ہی کسی سرزمین میں اللہ تعالیٰ اس کے لیے آزادی اور تمکن کے ساتھ رہنے بسنے کا سامان کر دیتے ہیں۔ان دونوں ہی صورتوں میں رسولوں سے متعلق خدا کی وہ سنت لازماً روبہ عمل ہو جاتی ہے جو قرآن میں اس طرح بیان ہوئی ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ یُحَآدُّوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗٓ ، اُولٰٓئِکَ فِی الْاَذَلِّیْنَ . کَتَبَ اللّٰہُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ، اِنَّ اللّٰہَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ .

’’بے شک، وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کر رہے ہیں، وہی ذلیل ہوں گے۔اللہ نے لکھ رکھا ہے کہ میں غالب رہوں گا اور میرے رسول بھی۔بے شک اللہ قوی ہے، بڑا زبردست ہے۔‘‘ (المجادلہ ۵۸: ۲۰-۲۱)

پہلی صورت میں رسول کے قوم کو چھوڑنے کے بعد یہ ذلت اس طرح مسلط کی جاتی ہے کہ آسمان کی فوجیں نازل ہوتیں، ساف و حاصب کا طوفان اٹھتا اور ابر و باد کے لشکر قوم پر اس طرح حملہ آور ہو جاتے ہیں کہ رسول کے مخالفین میں سے کوئی بھی زمین پر باقی نہیں رہتا۔قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ قومِ نوح، قومِ لوط، قومِ صالح، قومِ شعیب اور اس طرح کی بعض دوسری اقوام کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا۔اس سے مستثنیٰ صرف بنی اسرائیل رہے جن کے اصلاً توحید ہی سے وابستہ ہونے کی وجہ سے سیدنا مسیح علیہ السلام کے ان کو چھوڑنے کے بعد ان کی ہلاکت کے بجائے ہمیشہ کے لیے مغلوبیت کا عذاب ان پر مسلط کر دیا گیا۔دوسری صورت میں عذاب کا یہ فیصلہ رسول اور اس کے ساتھیوں کی تلواروں کے ذریعے سے نافذ کیا جاتا ہے۔اس صورت میں، ظاہر ہے کہ قوم کو کچھ مہلت مل جاتی ہے۔رسول اس عرصے میں دارالہجرت کے مخاطبین پر اتمامِ حجت بھی کرتا ہے، اپنے اوپر ایمان لانے والوں کی تربیت اور تطہیر و تزکیہ کے بعد انھیں اس معرکۂ حق و باطل کے لیے منظّم بھی کرتا ہے اور دارالہجرت میں اپنا اقتدار بھی اس قدر مستحکم کر لیتا ہے کہ اس کی مدد سے وہ منکرین کے استیصال اور اہل حق کی سرفرازی کا یہ معرکہ سر کر سکے۔اس سارے عمل کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ رسول کے مخالفین اور موافقین بالکل ممیّز ہو کر اس طرح سامنے آ جاتے ہیں کہ سنتِ الٰہی کے مطابق فیصلے سے پہلے ہر گروہ کو اس کی تمام تر خصوصیات کے ساتھ بالکل الگ دیکھ لیا جا سکتا ہے۔قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ فریقین میں بالعموم تین ہی قسم کے لوگ ہوتے ہیں: مخالفین میں معاندین، متربصین اور مغفلین اور موافقین میں سابقینِ اولین، متبعین بالاحسان اور ضعفا و منافقین۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

''معاندین'' سے مراد وہ لوگ ہیں جو دعوت کے موثر ہوتے ہی بالکل کھلم کھلا اور پوری شدت کے ساتھ اس کے مقابلے میں آ کھڑے ہوتے ہیں۔ان کی اس مخالفت کا محرک حمیتِ جاہلی بھی ہوتی ہے، حسد و تکبر بھی اور مفاد پرستی بھی۔ یہ تینوں محرکات مخالفت کی نوعیت کے لحاظ سے یکساں، لیکن اپنی حقیقت کے اعتبار سے بالکل الگ الگ ہیں۔

پہلا محرک بالعموم ان لوگوں کو مقابلے پر لاتا ہے جو اپنے زمانے کی جاہلیت کے ساتھ پوری طرح مخلص اور اس کے نظام کے سچے خادم ہوتے ہیں۔ وہ پیغمبر کی دعوت کو اپنے نظام اور اس کے پس منظر میں موجود اپنے آبا کی روایات کے لیے ایک چیلنج سمجھ کر اس کے مقابلے میں آتے ہیں۔ ان کی یہ مخالفت چونکہ قومی حمیت پر مبنی ہوتی ہے، اس وجہ سے اس میں رذالت اور کمینگی نہیں ہوتی۔ چنانچہ یہ اگر مخالف رہتے ہیں تو ابوجہل کی طرح قوم پرستی کے پورے ولولے کے ساتھ مخالف رہتے اور اگر ایمان لاتے ہیں تو حضرتِ عمر اور حضرتِ حمزہ کی طرح پورے دل اور پوری جان سے ایمان لاتے ہیں۔

دوسرا محرک عموماً ان لوگوں کو معاندت پر ابھارتا ہے جو وقت کے نظام میں نسلاً بعد نسلٍ دینی یا دنیوی ریاست کے مالک چلے آ رہے ہوتے ہیں۔ یہ لوگ سرداری اور پیشوائی کے ایسے عادی ہو جاتے ہیں کہ پھر کسی پیغمبر کو بھی اپنا سردار اور پیشوا ماننا ان کے لیے ممکن نہیں ہوتا اور وہ حق کو بھی لازماً اپنا پیرو بنا کر رکھنا چاہتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہی لوگ تھے جنھوں نے کہا کہ اگر اللہ کو اپنی ہدایت نازل کرنا تھی تو یہ طائف اور ام القریٰ کے کسی بڑے سردار پر کیوں نازل نہ ہوئی۔[6] یہود نے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت اسی محرک کے تحت کی۔[7] حضرت مسیح علیہ السلام کے زمانے میں بنی اسرائیل کے مذہبی پیشوا، فقیہ اور فریسی اسی بنا پر ایمان کی نعمت سے محروم رہے اور آں جناب کی یہ بات ان پر پوری طرح صادق آئی کہ اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے نکل جانا اس سے آسان ہے کہ دولت مند خدا کی بادشاہی میں داخل ہو۔[8] اس طرح کے لوگ شروع شروع میں پیغمبر اور اس کی دعوت دونوں کو حقیر سمجھ کر اس سے بالکل صرف نظر کیے رہتے ہیں، لیکن جب دیکھتے ہیں کہ اس کا اثر لوگوں میں بڑھ رہا ہے تو حسد کی آگ میں جل اٹھتے اور وہ سب کچھ کر گزرتے ہیں جو حاسدین اس دنیا میں اپنے مخالفین کے خلاف کرتے رہے ہیں۔

تیسرا محرک عام طور پر ان لوگوں کو آمادۂ مخالفت کرتا ہے جو اپنے ذاتی مفادات سے آگے کسی چیز کو دیکھنے پر کبھی آمادہ نہیں ہوتے۔ وہ ہر معاملے میں اپنی ذات کے اسیر، ہر قدم پر استحقاق کے طالب اور ہر شے کے حق و باطل کا فیصلہ اپنی ذات کے حوالے سے کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ چنانچہ اپنی اس اخلاقی پستی اور دنائت کی وجہ سے وہ بس اپنے مفادات ہی کی طرف لپک سکتے ہیں، پیغمبر کی دعوت کو قبول کرنا اور اس کے عقبات سے گزرنا ان کے لیے کسی طرح ممکن نہیں ہوتا۔ نبی صلی اللہ علیہ

6۔ الزخرف ۴۳:۳۱۔

7۔ البقرہ ۲:۱۰۹۔

8۔ متی ۱۹:۲۴۔

وسلم کی دعوت کے مقابلے میں ابولہب کا وجود اسی کی مثال ہے۔

''متربصین'' سے مراد وہ لوگ ہیں جن پر پیغمبر کی دعوت کا حق ہونا تو کسی حد تک واضح ہوتا ہے، لیکن وہ حق کو مجرد حق کی بنیاد پر ماننے کے بجائے اس انتظار میں رہتے ہیں کہ دیکھیں مستقبل اس دعوت کے بارے میں کیا فیصلہ سناتا ہے۔ چنانچہ پیغمبر کے مقابلے میں یہ زیادہ سرگرمی تو نہیں دکھاتے، لیکن ساتھ ہمیشہ مخالفین ہی کا دیتے ہیں اور شب و روز اسی کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ حق و باطل میں سمجھوتے کی کوئی صورت پیدا ہو جائے، اور ان کو اس معاملے میں کوئی فیصلہ کرنے کی زحمت نہ اٹھانی پڑے۔ آزمایش اور کشمکش کے زمانے میں یہ پیغمبر کے حق میں کوئی کلمۂ خیر بھی کہہ سکتے ہیں، اس کے بارے میں کبھی اپنی پسندیدگی بھی ظاہر کر سکتے ہیں، اپنے دل میں اس کی کامیابی کے متمنی بھی ہو سکتے ہیں اور کبھی اس کی مالی یا اخلاقی مدد کا حوصلہ بھی کر سکتے ہیں، لیکن اس زمانے میں اسے ماننا اور اس کے لیے جوکھم برداشت کر لینے پر آمادہ ہو جانا، ان کے لیے کسی طرح ممکن نہیں ہوتا۔

''مغفلین'' سے مراد وہ عوام الناس ہیں جو ذہنی اور معاشی لحاظ سے اپنے وقت کے نظام کے تابع اور ہر معاملے میں اپنے زمانے کے مذہبی پیشواؤں اور سیاسی رہنماؤں کے پیرو ہوتے ہیں۔ چنانچہ پیغمبر کی دعوت کے معاملے میں بھی یہ انھی کے اشاروں پر چلتے اور انھی کی طرف سے کسی اقدام کے منتظر رہتے ہیں۔ پہلے مرحلے میں ان کا طرزِ عمل عموماً یہی ہوتا ہے، لیکن اس کے بعد جب ان کے پیشوا پیغمبر کی مخالفت میں خم ٹھونک کر میدان میں اترتے ہیں تو علم و استدلال اور سیرت و اخلاق کے اعتبار سے جو فرق ان کے لیڈروں اور پیغمبر میں ہوتا ہے، وہ بالکل نمایاں ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اس وقت یہ اپنے لیڈروں سے بدگمان ہو کر ان سے ٹوٹتے اور پیغمبر کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان کے اندر یہ تبدیلی ان میں سے بعض جرأت مند اور اونچی سیرت کے لوگوں کو اقدام پر آمادہ کرتی ہے اور اس کے نتیجے میں یکے بعد دیگرے یہ پیغمبر سے وابستہ ہوتے چلے جاتے ہیں۔

''سابقین اولین'' کی اصطلاح قرآنِ مجید میں ان لوگوں کے لیے استعمال ہوئی ہے جو کسی دعوتِ حق کو سنتے ہی اس کی طرف لپکتے ہیں اور ہر نتیجے سے بے پروا ہو کر اپنا سب کچھ اس کے لیے قربان کر دینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کی فطرت صالح، عقل بیدار، دل زندہ، آنکھیں بینا، کان شنوا اور دماغ ہر صحیح بات کو سمجھنے اور قبول کر لینے کے لیے پوری طرح تیار ہوتا ہے۔ یہ چیزوں کو عقل و فطرت کی روشنی میں دیکھتے اور جب ان کی صحت پر مطمئن ہو جاتے ہیں تو ہر طرح کے جذبات و تعصّبات سے بلند اور تمام خطرات سے بے خوف ہو کر برملا ان کا اعتراف و اقرار کر لیتے ہیں۔ یہ سیرت و کردار کے لحاظ سے اپنی قوم میں گلِ سرسبد اور اپنی سرزمین پر ہمالہ و الوند کی طرح نمایاں ہوتے ہیں۔ دعوتِ حق ان کے لیے کوئی اجنبی چیز نہیں ہوتی، بلکہ ان کے دل کی آواز، ان کے ضمیر کی صدا اور ان کی روح کا نغمہ ہوتی ہے، اور یہ بس منتظر ہی ہوتے ہیں کہ کوئی اٹھے اور یہ اس کا ساتھ دینے کے لیے اپنے سارے دل اور ساری جان کے ساتھ اس کی خدمت میں حاضر ہو جائیں۔ چنانچہ

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

پیغمبر جب اپنی دعوت کی صدا بلند کرتا ہے تو یہ نہ عذر تراشتے ہیں، نہ اس کا حسب ونسب دیکھتے ہیں، نہ ماضی وحال کا تجزیہ کرتے ہیں، نہ شخصیت کے بخیے ادھیڑتے ہیں، نہ معجزے طلب کرتے ہیں، نہ حجتیں کھڑی کرتے ہیں اور نہ لاطائل بحثیں کرتے ہیں، بلکہ فوراً یہ کہتے ہوئے کہ: میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے ـــــ اس کی دعوت پر لبیک کہتے ہیں اور اس عزم کے ساتھ اس کے شانہ بہ شانہ کھڑے ہو جاتے ہیں کہ اب ہرگز پیچھے نہ ہٹیں گے:

ولو قطعوا راسی لدیك واوصالی

''متبعین بالاحسان'' وہ لوگ ہیں جو سابقینِ اولین کے اقدام کے بعد ان کو دیکھ کر حق کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ یہ عقلی اور اخلاقی اعتبار سے پہلی صف کے لوگ تو نہیں ہوتے، لیکن صفِ دوم میں یقیناً سب سے بہتر ہوتے ہیں۔ سابقینِ اولین کی طرح یہ بطورِ خود اگر آگے نہیں بڑھتے تو اپنے پیش رووں کی جرأت وعزیمت، حق کے لیے اُن کی سبقت اور اس راہ کے عقبات میں ان کی استقامت کو دیکھ کر پیچھے رہنا بھی ان کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ دعوتِ حق کی عقلی اور استدلالی قوت، بے شک انھیں اتنا متاثر نہیں کرتی، لیکن اہلِ ہمت کا شوق اور ان کی عزیمت جلد یا بدیر انھیں لازماً تسخیر کر لیتی ہے۔ تاہم پیغمبر کو ان کے معاملے میں کچھ جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ چنانچہ حق کے متعلق جو شبہات خود ان کے دل میں پیدا ہوتے ہیں اور جو دوسروں کے پیدا کرنے سے پیدا ہو سکتے ہیں، وہ سب اگر دور کر دیے جائیں اور عزم وہمت کی کچھ مثالیں ان کے سامنے آ جائیں تو ان کی فطرت کا زنگ اتر جاتا ہے۔ اس کے بعد اگر اللہ توفیق دے تو یہ پیغمبر کے ساتھی بن جاتے ہیں اور ہر آزمایش میں پورے خلوص اور حوصلے کے ساتھ اس کا ساتھ دیتے ہیں۔

''ضعفا ومنافقین'' میں مشابہت محض ظاہری ہوتی ہے۔ اپنی نیت اور ارادے کے اعتبار سے یہ بالکل الگ الگ لوگ ہیں۔ چنانچہ ان کے اوصاف وخصائص کو بھی اسی طرح الگ الگ سمجھنا چاہیے۔

''ضعفا'' سے مراد وہ لوگ ہیں جو پیغمبر کی دعوت کو کسی نہ کسی مرحلے میں، بلکہ بعض اوقات اس کی ابتدا ہی میں قبول کر لیتے ہیں اور ان کی نیت بھی یہی ہوتی ہے کہ اپنی زندگی میں اس کے تقاضے پورے کریں، لیکن قوتِ ارادی میں کمزوری کی وجہ سے بار بار گرتے اور اٹھتے ہیں۔ تاہم ان کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ ہر بار جب گرتے ہیں تو توبہ واستغفار کے ذریعے سے اپنی خطاؤں کا ازالہ کرتے اور اپنا سفر ہر حال میں راہِ حق ہی پر جاری رکھتے ہیں۔

''منافقین'' اس کے برخلاف وہ لوگ ہیں جو کبھی محض عارضی تاثر کی بنا پر اور کبھی بہت سوچ سمجھ کر شرارت کے ارادے سے پیغمبر کے ساتھ آ جاتے ہیں۔ پہلی صورت میں یہ ہمیشہ 'مذبذبین بین ذلك لا الی هؤلاء ولا الی هؤلاء'[9] کی تصویر بنے رہتے ہیں اور دوسری صورت میں ان کی حیثیت اہل ایمان کی صفوں میں دشمنوں کے ایجنٹ کی ہوتی ہے۔ چنانچہ ان کا کردار بھی وہی ہوتا ہے جس کی توقع اس طرح کے کسی ایجنٹ سے کی جا سکتی ہے۔

9۔ النساء ۴: ۱۴۳، ''درمیان میں لٹک رہے ہیں، نہ اِدھر ہیں نہ اُدھر۔''

پیغمبر کے مخاطبین میں موافقین اور مخالفین کے یہ دونوں فریق جب پوری طرح ممیّز ہو جاتے ہیں اور پیغمبر بھی اپنے ساتھیوں کی معیت میں جنگ کے لیے تیار ہو جاتا ہے تو خدا کی عدالت اپنا فیصلہ سنا دیتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت میں یہ فیصلہ جس طرح صادر ہوا، اس کی تفصیلات یہ ہیں:

۱۔ قریش کی قیادت میں سے تمام معاندین بدر کے موقع پر ہلاک کر دیے گئے۔ یہ صرف ابولہب تھا، جس نے اس عذاب سے بچنے کی کوشش کی اور جنگ میں شامل نہیں ہوا۔ قرآن اس کے بارے میں اعلان کر چکا تھا کہ اپنے اعوان و انصار کے ساتھ اسے بھی بہرحال ہلاک ہونا ہے[۱۰]۔ چنانچہ بدر میں قریش کی شکست کے سات دن بعد یہ پیشین گوئی حرف بہ حرف پوری ہو گئی اور بنی ہاشم کے اس سردار کا عدسہ کی بیماری سے اس طرح خاتمہ ہوا کہ مرنے کے بعد بھی تین دن تک کوئی اس کے پاس نہ آیا۔ یہاں تک کہ اس کی لاش سڑ گئی اور بدبو پھیلنے لگی۔ آخرکار ایک گڑھا کھدوایا گیا اور لکڑیوں سے دھکیل کر اس کی لاش اس میں پھینک دی گئی۔

۲۔ احد اور احزاب میں مسلمانوں کی تطہیر و تزکیہ کے بعد مشرکینِ عرب کے تمام متربصین اور مغفلین کو الٹی میٹم دے دیا گیا کہ ان کے لیے چار مہینے کی مہلت ہے۔ اس کے بعد رسوائی کا عذاب ان پر مسلط ہو جائے گا جس سے نکلنے کی کوئی راہ وہ اس دنیا میں نہ پا سکیں گے[۱۱]۔

۳۔ ۹ ہجری میں حج اکبر کے موقع پر اعلان کر دیا گیا کہ حرام مہینے گزر جانے کے بعد مسلمان ان مشرکین کو جہاں پائیں گے قتل کر دیں گے، الّا یہ کہ وہ ایمان لائیں، نماز کا اہتمام کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ اس سے مستثنیٰ صرف وہ لوگ ہیں جن کے ساتھ پیغمبر کے معاہدات ہیں۔ ان معاہدات کے بارے میں ہدایت کی گئی کہ ان کی مدت تک انھیں پورا کیا جائے۔ اس کے صاف معنی یہ تھے کہ مدت پوری ہو جانے کے بعد یہ معاہدین بھی اسی انجام کو پہنچیں گے جو مشرکین کے لیے مقدر کر دیا گیا ہے[۱۲]۔

۴۔ اہل کتاب کے تمام گروہوں کے بارے میں حکم دیا گیا کہ وہ اب جزیہ دے کر اور مسلمانوں کے زیردست کی حیثیت سے جئیں گے۔ انھیں بتا دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ اگر انھوں نے قبول نہ کیا تو پیغمبر اور اس کے ساتھیوں کی تلواریں انھیں بھی جہنم رسید کر دیں گی[۱۳]۔

۵۔ منافقین کو متنبہ کیا گیا کہ وہ اگر توبہ کر لیں تو ان کے حق میں بہتر ہے، ورنہ انھیں بھی عنقریب اسی انجام سے دوچار ہونا

۱۰؎ اللہب ۱۱۱: ۱۔۳۔

۱۱؎ التوبہ ۹: ۱۔۲۔

۱۲؎ التوبہ ۹: ۳۔۵۔

۱۳؎ التوبہ ۹: ۲۹۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

پڑے گا جو منکرین کے لیے مقدر ہے۔[14]

۶۔ مخلصین میں سے جن لوگوں سے غلطی ہوئی، انھیں کچھ سزا دے کر معاف کر دیا گیا[15] اور ضعیف مسلمانوں کو بشارت دی گئی کہ وہ اگر توبہ و اصلاح کے رویے پر قائم رہے تو توقع ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں بھی معاف فرما دیں گے۔[16]

۷۔ سابقین اولین کی قیادت میں سرزمین عرب کا اقتدار اور حرم کی تولیت مسلمانوں کے سپرد کر دی گئی اور اس طرح اللہ تعالیٰ کا وہ وعدہ پورا ہو گیا جو سورۂ نور میں ان کے لیے بیان ہوا ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا، يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا، وَ مَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ. (۲۴:۵۵)

''تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے، ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ ان کو وہ اس ملک میں اقتدار عطا فرمائے گا، جس طرح اس نے ان لوگوں کو اقتدار عطا فرمایا جو ان سے پہلے گزرے اور ان کے اس دین کو مضبوطی سے قائم کر دے گا جو اس نے ان کے لیے پسند فرمایا اور ان کے خوف کو امن میں بدل دے گا۔ وہ میری ہی عبادت کریں گے اور کسی چیز کو میرے ساتھ شریک نہ کریں گے اور جو اس کے بعد پھر منکر ہوں گے، وہی ہیں جو نافرمان ٹھیریں گے۔''

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ذریت ابراہیم کی دعوت

وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ، هُوَ اجْتَبٰكُمْ، وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ، مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ، هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا، لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ. (الحج ۲۲:۷۸)

''اور اللہ کی راہ میں جدوجہد کرو جیسا کہ اِس جدوجہد کا حق ہے۔ اُسی نے تم کو (اِس ذمہ داری کے لیے) منتخب کیا ہے اور دین کے معاملے میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔ تمھارے باپ ابراہیم کا طریقہ تمھارے لیے پسند فرمایا ہے۔ اُس نے تمھارا نام

۱۴؎ التوبہ ۹:۷۴، ۱۰۱۔

۱۵؎ التوبہ ۹:۱۱۸۔

۱۶؎ التوبہ ۹:۱۰۲۔

مسلمان رکھا تھا، اس سے پہلے بھی اور اِس (آخری بعثت کے دور) میں بھی۔ اِس لیے (منتخب کیا ہے) کہ رسول تم پر گواہی دے اور دنیا کے باقی لوگوں پر تم (اِس دین کی) گواہی دینے والے بنو۔''

یہ دعوت وہی ''شہادت علی الناس'' ہے جس کا ذکر اس سے پہلے پیغمبر کی دعوت میں ہوا ہے۔ سورۂ حج کی اس آیت میں قرآن نے بتایا ہے کہ ذریت ابراہیم کو بھی اللہ تعالیٰ نے اس شہادت کے لیے اسی طرح منتخب کیا اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے جدوجہد کا حکم دیا، جس طرح وہ بنی آدم میں سے بعض جلیل القدر ہستیوں کو نبوت و رسالت کے لیے منتخب کرتا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے:

اِنَّ اللّٰہَ اصۡطَفٰۤی اٰدَمَ وَ نُوۡحًا وَّ اٰلَ اِبۡرٰہِیۡمَ وَاٰلَ عِمۡرٰنَ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ . (آل عمران ۳:۳۳)	''اللہ نے آدم اور نوح کو، اور ابراہیم اور عمران کی ذریت کو تمام دنیا والوں پر ترجیح دے کر (اُن کی ہدایت کے لیے) منتخب فرمایا۔''

''پیغمبر کی دعوت'' کے زیرعنوان ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ شہادت درحقیقت دنیا میں خدا کی دینونت کا ظہور ہے۔ اس کی جو تاریخ قرآن مجید اور دوسرے الہامی صحیفوں میں بیان ہوئی ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس کا پہلا ظہور سیدنا نوح علیہ السلام کی دعوت میں ہوا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے دنیا کی تمام قوموں میں وقتاً فوقتاً اپنے رسول اسی دینونت کے ظہور کے لیے بھیجے۔ یہاں تک کہ سیدنا ابراہیم کی بعثت ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے فیصلہ فرمایا کہ اب یہ منصب ان کی ذریت کو بھی بحیثیت جماعت عطا ہوگا اور ان کے ذریعے سے دین کی حجت سارے عالم پر قائم کی جائے گی۔ قرآن اور بائیبل، دونوں میں اس عالمی دینونت کی سرگزشت بڑی تفصیل کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔ قرآن نے تین و زیتون، طور سینین اور مکہ کے شہر امین کی قسم میں اسی کا حوالہ دیا ہے۔ زیتون وہ پہاڑ ہے جہاں سیدنا مسیح علیہ السلام کے اٹھائے جانے کے بعد ان کے منکرین پر قیامت تک کے لیے عذاب کا فیصلہ سنایا گیا اور بنی اسرائیل میں سے ان کے ماننے والوں کی ایک نئی امت، نصاریٰ کی ابتدا ہوئی۔ تین اسی پر واقع ایک گاؤں ہے۔ اس کا ذکر انجیل میں Beth Phage کے نام سے ہوا ہے۔ اس میں Phage دراصل Fig ہے جسے عربی زبان میں تین کہتے ہیں۔ لوقا (۱۹:۲۹) میں ہے کہ مسیح علیہ السلام جب یروشلم آئے تو شہر میں داخل ہونے سے پہلے اسی جگہ ٹھیرے۔ جبل طور کے بارے میں معلوم ہے کہ بنی اسرائیل نے بحیثیت امت اپنی زندگی اسی پہاڑ سے شروع کی۔ ام القریٰ مکہ سے بنی اسمٰعیل نے اپنی قومی زندگی کا آغاز کیا اور خدا کی زمین پر اس کی عبادت کے اولین مرکز، بیت الحرام کی تولیت انھیں عطا کی گئی۔ اس سے واضح ہے کہ یہ تینوں ذریت ابراہیم کے لیے خدا کی دینونت کے مقامات ظہور ہیں۔ قرآن نے ان کی شہادت پیش کر کے فرمایا ہے کہ دنیا میں اس جزا و سزا کو دیکھنے کے بعد وہ کیا چیز ہے جو قیامت میں خدا کی جزا و سزا کو جھٹلا سکتی ہے؟ ارشاد فرمایا ہے:

وَالتِّیۡنِ وَالزَّیۡتُوۡنِ . وَطُوۡرِ سِیۡنِیۡنَ . وَھٰذَا	''تین اور زیتون گواہی دیتے ہیں، اور طور سینین اور

الْبَلَدِ الْاَمِیْنِ. لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ. ثُمَّ رَدَدْنٰہُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ. اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَھُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ. فَمَا یُکَذِّبُکَ بَعْدُ بِالدِّیْنِ. اَلَیْسَ اللّٰہُ بِاَحْکَمِ الْحٰکِمِیْنَ. (التین ۹۵: ۱۔۸)

(تمھارا) یہ شہر امین بھی کہ انسان کو ہم نے (اِن مقامات پر) پیدا کیا تو اُس وقت وہ بہترین ساخت پر تھا۔ پھر ہم نے اُسے پستی میں ڈال دیا، اِس طرح کہ وہ خود ہی پستیوں میں گرنے والا ہوا۔ رہے وہ جو ایمان پر قائم رہے اور اُنھوں نے نیک عمل کیے تو اُن کے لیے ایسا اجر ہے جو کبھی ختم نہ ہو گا۔ اس کے بعد کیا چیز ہے، (اے پیغمبر)، جو روز جزا کے بارے میں تمھیں جھٹلاتی ہے؟ (اِن سے پوچھو)، کیا اللہ سب فیصلہ کرنے والوں سے بہتر فیصلہ کرنے والا نہیں ہے؟''

سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسمٰعیل کو اسی بنا پر درمیان کی جماعت 'امۃ وسطاً' قرار دیا ہے جس سے ایک طرف خدا اور اس کا رسول اور دوسری طرف 'الناس' یعنی دنیا کی سب اقوام ہیں اور فرمایا ہے کہ جو شہادت رسول نے تم پر دی ہے، اب وہی شہادت باقی دنیا پر تمھیں دینا ہو گی:

وَکَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّۃً وَّسَطًا لِّتَکُوْنُوْا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ، وَیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْکُمْ شَھِیْدًا. (۲: ۱۴۳)

''اور اِسی طرح ہم نے تمھیں ایک درمیان کی جماعت بنایا تاکہ تم لوگوں پر (حق کی) شہادت دینے والے بنو اور رسول تم پر یہ شہادت دے۔''

یہی بات آل عمران میں اس طرح واضح فرمائی ہے:

کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ، تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ. (۳: ۱۱۰)

''تم وہ بہترین جماعت ہو جو لوگوں (پر حق کی شہادت) کے لیے برپا کی گئی ہے۔ (اس لیے کہ) تم (ایک دوسرے کو) بھلائی کی تلقین کرتے ہو، برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر سچا ایمان رکھتے ہو۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد اللہ تعالیٰ کا جو عذاب جزیرہ نماے عرب سے باہر کی اقوام پر مسلمانوں کی تلواروں کے ذریعے سے نازل ہوا، وہ اسی شہادت کا نتیجہ تھا۔ اس عذاب کا فیصلہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان اقوام کے سربراہوں کو خط لکھ کر کر دیا تھا۔ یہ خطوط جن اقوام کے سربراہوں کو لکھے گئے، ان کا علاقہ کم و بیش وہی ہے جسے تورات میں ذریت ابراہیم کی میراث کا علاقہ قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ جزیرہ نما میں اپنی حکومت مستحکم کر لینے کے بعد بنی اسمٰعیل کے اہل ایمان اس فیصلے کو نافذ کرنے کے لیے اس اعلان کے ساتھ ان اقوام پر حملہ آور ہو گئے کہ اسلام قبول کر و یا زیردست بن کر جزیہ دینے کے لیے تیار ہو جاؤ، اس کے سوا اب زندہ رہنے کی کوئی صورت تمھارے لیے باقی نہیں رہی۔ ان میں سے کوئی قوم بھی

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اصلاً شرک کی علم بردار نہ تھی، ورنہ وہ اس کے ساتھ بھی وہی معاملہ کرتے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین عرب کے ساتھ کیا تھا۔

بنی اسمٰعیل کی یہی شہادت ہے جس سے دین کی حجت پورے عالم پر قائم ہوئی ہے، لیکن قوموں کی جزا و سزا کا فیصلہ چونکہ اللہ کے حکم ہی سے ہوسکتا ہے، اس لیے ان اقوام کے علاوہ جن کا تعین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کر دیا تھا، وہ اپنی دعوت کے منکرین کو خود کوئی سزا نہیں دے سکتے تھے۔

سورۂ زمر میں قیامت کی جزا و سزا کے موقع پر جن 'شہداء' کے بلائے جانے کا ذکر ہوا ہے، ان سے مراد ہمارے نزدیک یہی سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی ذریت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے شہادت کا جو منصب انھیں دنیا میں عطا فرمایا، اس کی بنا پر قیامت میں بھی وہ اسی طرح شہادت کے لیے بلائے جائیں گے، جس طرح انبیا علیہم السلام کو بلایا جائے گا:

وَ نُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ ، اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰہُ ، ثُمَّ نُفِخَ فِیْہِ اُخْرٰی، فَاِذَا ھُمْ قِیَامٌ یَّنْظُرُوْنَ، وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّھَا ، وَوُضِعَ الْکِتٰبُ ، وَجِایْٓءَ بِالنَّبِیّٖنَ وَالشُّھَدَآءِ ، وَ قُضِیَ بَیْنَھُمْ بِالْحَقِّ ، وَھُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ. (۳۹: ۶۸۔۶۹)

''اور اُس دن صور پھونکا جائے گا تو زمین و آسمان میں جو بھی ہیں، سب بے ہوش ہو کر گر پڑیں گے، سوائے اُن کے جنھیں اللہ چاہے گا۔ پھر دوسری مرتبہ وہی صور پھونکا جائے گا تو یکایک وہ کھڑے ہو کر دیکھنے لگیں گے اور زمین اُس دن اپنے پروردگار کے نور سے روشن ہو جائے گی اور عمل کا دفتر رکھ دیا جائے گا اور سب پیغمبر بلائے جائیں گے اور وہ بھی جو شہادت کے منصب پر فائز کیے گئے اور لوگوں کے درمیان بالکل حق کے مطابق فیصلہ کر دیا جائے گا، اِس طرح کہ اُن پر کوئی ظلم نہ ہوگا۔''

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ڈاکٹر محمد فاروق خان

امریکہ کا کردار

امت مسلمہ اور پاکستان کے تناظر میں

(۲)

امریکہ ـــــ ہمارا دوست یا دشمن

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

عالم اسلام کے اندر اس وقت اس سوال پر بڑی بحث ہو رہی ہے کہ آیا امریکہ پورے عالم اسلام اور بذات خود مذہب اسلام کو دشمن کی نظر سے دیکھتا ہے یا وہ درحقیقت عالم اسلام کا دوست ہے۔ یا پھر یہ کہ وہ عالم اسلام کا نہ دوست ہے نہ دشمن، بلکہ وہ عالم اسلام کے ہر ملک سے علیحدہ علیحدہ محض تعلقات کار رکھنا چاہتا ہے۔

جو مکتب فکر یہ سمجھتا ہے کہ امریکہ پورے عالم اسلام اور بذات خود مذہب اسلام کا دشمن ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ امریکہ دراصل اسی استعماری اور سامراجی قوت کا تسلسل ہے جس نے مسلمانوں کے ساتھ صلیبی جنگیں چھیڑیں اور جو بعد میں یورپی نوآبادیاتی طاقتوں کی شکل میں ایشیا اور پھر افریقہ پر قابض ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ پچھلے پچاس برس سے اسرائیل کی مسلسل اور غیر متزلزل حمایت کر رہا ہے۔ امریکہ نے ۱۹۹۰ء میں خلیجی جنگ کے بعد تمام خلیجی ملکوں اور سعودی عرب میں اپنے فوجی اڈے قائم کر لیے۔ ''القاعدہ'' کے بہانے سے اس نے طالبان کی حکومت ختم کر دی اور اب عراق کے درپے ہے۔ اس کے بعد اغلباً ایران اور پھر پاکستان کی باری ہے۔

دوستی کی بات کرنے والا مکتب فکر درج بالا دلائل کو غلط سمجھتا ہے۔ اس کے خیال میں صلیبی جنگوں سے پہلے اور صلیبی جنگوں کے بعد ایک لمبے عرصے تک مسلم ملکوں اور یورپی طاقتوں میں دوستی بھی رہی ہے۔ اس دوران میں خود عیسائی یورپی ملکوں میں بھی آپس میں بڑی خون ریز لڑائیاں ہوئی ہیں۔ اس کے بعد افریقہ اور ایشیا پر یورپی قبضہ دراصل ٹیکنالوجی کی قوت کا مظہر تھا۔ اس میں بھی عیسائی یورپی طاقتیں آپس میں کبھی متحد نہیں رہیں، بلکہ انگریزوں، فرانسیسیوں، پرتگیزیوں اور ولندیزیوں

کے درمیان اس دوران میں بڑی جنگیں ہوئی ہیں۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم بھی اصلاً یورپی عیسائی طاقتوں کی آپس کی لڑائی تھی جس میں دونوں طرف سے کروڑوں لوگ ہلاک ہوئے۔ آج امریکہ عالم اسلام کے غریب ممالک کو سب سے زیادہ امداد دینے والا ملک ہے، خصوصاً پاکستان کی ترقی کی ایک ایک اینٹ امریکی امداد کی مرہون منت ہے۔ امریکہ نے مسلمان ممالک کو کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچایا، سوائے ان مواقع کے کہ جب کسی نے خود آگے بڑھ کر امریکی مفادات یا امریکہ پر براہ راست حملہ کر دیا ہو۔ دو یورپی مسلمان ملکوں یعنی بوسنیا اور کوسووو کی آزادی دراصل امریکہ ہی کی مرہون منت ہے۔

ورکنگ ریلیشن شپ یا تعلقاتِ کار والے مکتب فکر کے خیال میں بین الاقوامی تعلقات میں نہ مستقل دوستی چلتی ہے، نہ مستقل دشمنی، بلکہ ہر ملک اپنے وقتی مفادات کی خاطر دوسروں سے تعلقات کار رکھتا ہے۔ امریکہ کی اصل دلچسپی اس خواہش سے ہے کہ اس کے سپر پاور ہونے کی حیثیت برقرار رہے اور اس کے مفادات کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ اس کی پچھلی تمام تاریخ اس امر کی گواہ رہی ہے کہ اس نے دوسرے ملکوں سے تعلقات ہمیشہ اسی وجہ سے اور یا پھر اپنی اندرونی سیاست کی وجہ سے رکھے ہیں اور اس میں اس نے مذہب، رنگ اور نسل کا خیال کم ہی رکھا ہے۔ پچھلے پچاس برس میں اس کا سب سے بڑا دشمن کمیونزم رہا ہے، جس کا علم بردار سفید فام عیسائی روس اور مشرقی یورپ تھا۔ تیس چالیس برس پہلے عراق، شام، لیبیا، ایران اور کئی دوسرے ممالک میں امریکہ مخالف انقلاب آئے، مگر امریکہ نے ان پر حملہ نہیں کیا، اس لیے کہ یہ حملے اس کو بہت مہنگے پڑتے۔ کئی بدھسٹ ممالک مثلاً جاپان، جنوبی کوریا، تائیوان اور تھائی لینڈ سے اس کے بہت اچھے تعلقات ہیں۔ زمبابوے اور جنوبی افریقہ میں اس نے سفید فام نسلی امتیاز پر مبنی حکومتوں کو ختم کرنے اور افریقی اکثریت کی حکومت کو قائم کرنے میں اپنا کردار ادا کیا۔ ایسے جھگڑے جن میں ایک فریق عیسائیوں پر مشتمل تھا، مثلاً اریٹریا اور صومالیہ کی آویزش، جنوبی سوڈان کی لڑائی اور بیافرا کے مسئلے پر اس نے عیسائیوں کا ساتھ نہیں دیا۔ افریقہ کے غریب ترین عیسائی ممالک کی امداد میں امریکہ نے کوئی خاص گرم جوشی نہیں دکھائی۔ اس کے برعکس اس نے کئی مسلمان ممالک مثلاً انڈونیشیا، بنگلہ دیش، سعودی عرب، کویت، ترکی اور مراکش وغیرہ سے قریبی تعلق رکھا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

درج بالا تینوں نقطہ ہاے نظر کے دلائل میں وزن موجود ہے۔ مناسب ہے کہ ان میں سے بعض امور پر خصوصی توجہ دی جائے خصوصاً ان مسائل پر جن کا تعلق موجودہ حالات سے ہے، تفصیل سے روشنی ڈالی جائے۔

مسلمانوں اور عیسائیوں کی تاریخی کشمکش

امریکی اقدامات کے تجزیے میں یہ نکتہ بھی بار بار آتا ہے کہ یہ دراصل عالم اسلام اور عیسائی دنیا کے درمیان تاریخی کشمکش کی ایک کڑی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ چودہ سو سال کی تاریخ پر ہماری نظر رہے۔

مسلمانوں نے اپنے ابتدائی چھ سو برس میں جتنا علاقہ فتح کیا، سوائے اندلس، بھارت اور فلسطین کے، کم وبیش باقی تمام علاقہ اب بھی عالم اسلام میں شامل ہے۔ اندلس کی حکومت کے خاتمے کی اصل وجہ آپس کی خانہ جنگی تھی۔ اس کے برعکس برصغیر

پر جن مسلمان حکمرانوں نے قبضہ کیا، انھیں یہاں اسلام کی دعوت پھیلانے سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ البتہ ارض فلسطین خصوصاً یروشلم ہمیشہ سے کشمکش کا مرکز رہا ہے۔ یروشلم پر مسلمانوں نے ۶۴۰ء میں قبضہ کر لیا تھا۔ اس کے بعد ۱۰۹۶ء یعنی اگلے ساڑھے چار سو برس سے بھی زیادہ عرصہ اس پر مسلمانوں کا قبضہ رہا۔ اس کے بعد ایک سو برس تک اس علاقے پر عیسائی طاقتوں کا قبضہ رہا۔ ۱۰۹۶ء سے لے کر ۱۲۷۱ء تک یعنی کم وبیش دو سو برس میں مسلم طاقتوں اور عیسائی طاقتوں کے درمیان آٹھ بڑی لڑائیاں لڑی گئیں جن میں پہلے عیسائی طاقتوں اور بعد میں مسلم طاقتوں کو کامیابی حاصل ہوئی۔ اس کے بعد اگلے سات سو برس مزید اس پر مسلمانوں کا قبضہ رہا۔ حتیٰ کہ جب عثمانی سلطنت نے پہلی جنگ عظیم میں جرمنی کا ساتھ دیا تو برطانیہ نے جرمنی کے ساتھ ساتھ عثمانی مملکت کو بھی شکست دیتے ہوئے اس کے زیر قبضہ تمام عرب علاقوں بشمول فلسطین و یروشلم پر قبضہ کر لیا۔ اگلے تیس برس تک یہاں انگریزوں کا قبضہ رہا۔ ان کے جانے پر فلسطین کا آدھا حصہ اسرائیل اور آدھا حصہ اردن کے قبضے میں آ گیا۔ بیت المقدس اردن کے قبضے میں رہا حتیٰ کہ ۱۹۶۷ء میں اسرائیل نے اس پر قبضہ کر لیا پچھلے پینتیس برس سے یروشلم اسرائیل کے قبضے میں ہے۔

گویا ارض فلسطین کے متعلق تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہاں پچھلی ایک صدی سے ہلال وصلیب اور ہلال وڈیوڈ سٹار کی کشمکش جاری ہے۔ تاہم باقی عالم اسلام پر یہ بات صادق نہیں آتی۔ اس بحث کے بعد یہ ضروری ہے کہ ان حالیہ اہم ترین مسائل کا تجزیہ کیا جائے جہاں امریکہ کے مقابل مسلمان قوتیں صف آرا ہیں۔

www.javedahmadghamidi.org www.al-mawrid.org

ا۔ طالبان اور القاعدہ

اس ضمن میں امریکہ مخالف نقطۂ نظر کے دلائل درج ذیل ہیں:

0 ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ کو ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملہ القاعدہ کا کام نہیں ہے۔ اس حملے کی منصوبہ بندی، فنی مہارت اور اس پر عمل درآمد کے لیے جو ٹیکنالوجی چاہیے وہ القاعدہ کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس لیے امریکہ کا یہ الزام بے بنیاد ہے۔

0 اس حملے سے سب سے زیادہ فائدہ یہودیوں کو پہنچا ہے۔ نیز ۱۱ ستمبر کے دن ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں کام کرنے والے چار ہزار یہودی غیر حاضر تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ حملہ یہودیوں نے کیا ہے اور یہودیوں کو اس کے بارے میں پہلے سے معلوم تھا۔

0 ملا عمر نے یہ پیش کش کی تھی کہ بن لادن پر افغانستان میں مقدمہ چلایا جائے، مگر اسے یک سر نظر انداز کر دیا گیا۔

0 افغانستان پر امریکی بم باری کے نتیجے میں تقریباً تیس ہزار افراد ہلاک ہوئے اور سیکڑوں عمارتیں ملبے کا ڈھیر بن گئیں۔ یہ بڑا ظلم اور سفاکی تھی۔

0 امریکہ کی نظر وسط ایشیا کے تیل پر ہے۔ جس کے لیے اس نے افغانستان کو فتح کیا۔ باقی تو محض بہانے ہیں۔

ان دلائل کے جواب میں امریکیوں کا نقطۂ نظر یہ ہے:

0 پوری دنیا میں القاعدہ ہی واحد ایسی آرگنائزیشن ہے جس نے امریکہ کے خلاف باقاعدہ تحریری طور پر پہلے ۱۹۹۶ء میں

اور پھر ۲۳ فروری ۱۹۹۸ کو اعلان جنگ کیا تھا۔ کینیا اور تنزانیہ میں امریکی سفارت خانوں پر حملے کے مجرم گرفتار ہو کر اعتراف جرم بھی کر چکے ہیں اور ان کو سزائیں بھی سنائی جا چکی ہیں۔ ان سب نے القاعدہ سے تعلق کا اعتراف کیا ہے۔ ۱۱ ستمبر کے تمام ۱۹ ہائی جیکروں کی شناخت ہو چکی ہے۔ وہ سب عرب تھے اور القاعدہ کے کارکن تھے۔ اس کام کی تربیت انھوں نے امریکہ ہی میں امریکہ کی اندرونی آزادیوں کی بدولت حاصل کی تھی۔ بن لادن اور القاعدہ کے دوسرے ذمہ داروں نے کئی وڈیو اور آڈیو ٹیپس میں اس حملے کا اعتراف کیا ہے۔ اس کے بعد بھی دنیا میں کئی حملے ہوئے ہیں مثلاً بالی انڈونیشیا والا دھماکا۔ ان سب میں القاعدہ ہی کے کارکنوں کو پکڑا گیا ہے۔ ہم یہ چاہتے تھے کہ بن لادن اور اس کے ساتھیوں پر امریکہ یا اقوام متحدہ کے کسی ادارے کے تحت مقدمہ چلایا جائے۔

0 یہودیوں کے ملوث ہونے والی بات محض افسانہ تھا جس کا کوئی ثبوت ہی نہیں۔ ممکن ہے کہ اس دن کچھ یہودی غیر حاضر ہوں، مگر اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ان کے ایک اہم مذہبی تہوار یوم کپور کا دن تھا، اس حملے میں اسرائیل کے ۴۹ شہری بھی ہلاک ہوئے تھے جو سب کے سب یہودی تھے۔ یہودیوں کو ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی تباہی سے کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچا۔ ویسے بھی احمقانہ ایکشن کا فائدہ مخالف کو پہنچتا ہے۔ اس لیے یہ کوئی دلیل نہیں بنتی۔ امریکہ پہلے بھی اسرائیل کا حامی تھا اور اب بھی ہے۔

0 طالبان انتظامیہ کے تحت بن لادن پر مقدمہ چلانا محض ایک مذاق ہوتا۔ اس لیے کہ کئی برس سے بن لادن ان کا فنانسر اور طالبان اس کے پشتی بان تھے۔

0 ہمارے اندازے کے مطابق امریکی بم باری سے پانچ ہزار کے لگ بھگ عام افراد ہلاک ہوئے۔ اگرچہ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ تاہم اس طرح کا نقصان کسی بھی جنگ کا ناگزیر حصہ ہوتا ہے۔

0 اگر وسط ایشیا کی تیل کی پائپ لائنوں پر قبضہ ہمارا بنیادی مقصد ہوتا تو ہم ۱۹۸۸ء میں افغانستان میں اپنی دلچسپی کیوں ختم کرتے؟ دوبارہ افغانستان کو اپنے کنٹرول میں لانے کے لیے ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی تباہی جیسا ڈرامہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ سب کچھ تو اس کے بغیر بھی ہم کر سکتے تھے۔

تبصرہ

کئی سوال ایسے ہیں جن کا جواب کسی بھی فریق کے پاس نہیں ہے۔ یہ بات معلوم ہے کہ بن لادن کو اصل غصہ سعودی سرزمین میں امریکی افواج کی موجودگی پر تھا۔ امریکیوں کے لیے یہاں سے اپنی افواج نکال کر کہیں اور تعینات کرنے میں کیا مشکل تھی اور انھوں نے ایسا کیوں نہیں کیا؟ اسی طرح امریکہ کے پاس اس سوال کا بھی کوئی جواب نہیں کہ اس نے دہشت گردی کی بنیادی وجوہات ختم کرنے کے لیے کیا کیا ہے؟ دوسری طرف طالبان کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں کہ امریکہ کے خلاف اعلان جنگ کے باوجود انھوں نے مسلسل بن لادن کو کیوں پناہ دی۔ اور پھر یہ کہ انھوں نے اپنے ملک اور حکومت کو امریکہ سے بچانے کی خاطر بن لادن کو امریکہ کے حوالے کرنے سے انکار کیوں کیا۔ امریکہ مجبور ہوتا کہ بن لادن پر

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

بہترین منصفانہ طریقے سے مقدمہ چلائے۔ بن لادن اسی مقدمے کو اپنے موقف کے لیے بڑی خوب صورتی سے استعمال کر سکتا تھا۔ اور اگر اسے اس مقدمے میں بڑی سے بڑی سزا بھی ہو جاتی تو کم از کم امریکہ کو افغانستان پر حملے کا بہانہ تو نہ ملتا۔

اس معاملے میں پاکستان کے کردار پر تبصرہ بھی ناگزیر ہے۔ یہ بات ہر کوئی جانتا ہے کہ ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ تک پاکستان پوری طرح طالبان کا حامی تھا۔ اس کی پالیسی میں اچانک تبدیلی کی وجہ تو سمجھ میں آتی ہے، مگر یہ بات ناقابل فہم ہے کہ اس وقت کی فوجی حکومت نے امریکہ کو لاجسٹک مدد کیوں فراہم کی اور کئی ہوائی اڈے کیوں ان کے حوالے کیے؟ وہ اس معاملے میں بآسانی معذرت کر سکتا تھا۔ اگرچہ اس سے امریکہ کا طالبان انتظامیہ پر حملہ زیادہ سے زیادہ کچھ مشکلات کا شکار ہو جاتا، مگر پاکستان ایک غلط اقدام سے تو بچ جاتا۔

ب۔ مسئلۂ فلسطین

اگر یہ کہا جائے کہ عالم اسلام میں امریکہ کی منفی تصویر کا اصل سبب یہی مسئلہ ہے تو اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہوگا۔ اس مسئلے میں امریکی مخالف نقطۂ نظر کے دلائل حسب ذیل ہیں:

0 اسرائیلی ریاست کی تخلیق برطانیہ کا ایک بڑا ظلم تھا اور اس ریاست کی مسلسل تعمیر اور حمایت امریکہ کی ایک بڑی بے انصافی ہے۔ مشرق وسطیٰ کی اب تک تمام خوں ریزی کی اصلاً ذمہ داری ان دونوں پر عائد ہوتی ہے۔

0 امریکہ نے ہر معاملے میں اسرائیل کی اندھادھند حمایت کی ہے۔ اسرائیل کے صریحاً ناجائز اقدامات پر بھی امریکہ نے کچھ نہیں کیا۔ کئی دفعہ ایسا بھی ہوا ہے کہ اقوام متحدہ اور دوسرے بین الاقوامی فورموں پر امریکہ اور اسرائیل ایک طرف تھے اور باقی ساری دنیا دوسری طرف۔

0 اسرائیل امریکی امداد کے سہارے زندہ ہے۔ اس کے باوجود امریکہ نے فلسطینی ریاست کے قیام کے لیے کبھی اسرائیل پر حقیقی دباؤ نہیں ڈالا۔ اگر امریکہ چاہے تو مختصر عرصے میں مشرق وسطیٰ میں امن قائم ہو سکتا ہے۔

دوسری طرف امریکیوں کے دلائل درج ذیل ہیں:

0 اسرائیل کے قیام میں برطانیہ کی پالیسیوں کے ساتھ ساتھ سلطنت عثمانیہ کی غلطیوں اور خود عربوں کی عملی مدد کا بھی بڑا کردار ہے۔ اگر سلطنت عثمانیہ پہلی جنگ عظیم میں جرمنی کا ساتھ نہ دیتی تو برطانیہ اس پر کبھی حملہ نہ کرتا اور اگر سرزمین عرب کا ہاشمی خاندان انگریزوں کی مدد نہ کرتا تو وہ کبھی فلسطین پر قابض نہیں ہو سکتے تھے۔ اور اگر مصر و مراکش اپنے ہاں کے یہودیوں کو اسرائیل جانے کی اجازت نہ دیتے تو اسرائیل کی آبادی نہیں بڑھ سکتی تھی۔

0 اسرائیل کی مسلسل عملی حمایت امریکہ کے علاوہ روس، چین، بھارت اور بہت سے دوسرے ملکوں نے بھی کی ہے۔

0 امریکہ کی یہودی کمیونٹی (تعداد: ۵۲ لاکھ) انتہائی منظّم، مال دار اور باصلاحیت ہے۔ اسرائیل کی حمایت میں یہ کمیونٹی مکمل متحد ہے۔ کوئی امریکی حکومت اس کمیونٹی کی مخالفت مول لینے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ اس لیے یہ ہر امریکی حکومت کی

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

سیاسی مجبوری ہے کہ وہ اسرائیل کی حمایت کرے۔اس کے برعکس امریکی مسلمان اورامریکی عرب بالکل غیر منظّم اور بیسیوں متحارب تنظیموں میں بٹے ہوئے ہیں۔ان کے درمیان اتحادعمل اورفکری ہم آہنگی کا فقدان ہے۔اس لیےامریکی سیاست پر ان کا کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا۔

0 خودعالم عرب بھی فلسطین کے معاملے میں بالکل غیر متحداور تضادات کا شکار ہے۔۱۹۶۷ءتک آدھا فلسطین اردن اور آدھا مصر کے قبضے میں تھا۔مگران دونوں مما لک نے اپنے زیرقبضہ علاقوں میں فلسطینی ریاست نہیں بننے دی۔اگر یہ دونوں مما لک اپنے ہاں فلسطینی ریاست کا قیام عمل میں لے آتے تو ہم فوراًاس کوتسلیم کر لیتے۔

0 عالم عرب نے اقوام متحدہ کی متعددقرار دادیں تسلیم نہ کر کے بے بصیرتی کا ثبوت دیا۔اگر ۱۹۴۸ءکی قرار داد مان لی جاتی تو اسرائیل آج کی نسبت ایک تہائی ہوتا اوراسی وقت فلسطینی ریاست بھی بن جاتی۔

0 فلسطینیوں نے ۲۰۰۰ء کے کیمپ ڈیوڈ مذاکرات میں صدرکلنٹن کا پیش کردہ حل نہ مان کر بڑی غلطی کی جس کے مطابق مغربی کنارے کا دوتہائی حصہ،آدھا یروشلم بشمول مسجداقصیٰ اور پوراغزہ فلسطینی ریاست میں شامل ہو جاتا۔اسرائیل نے اس کو مان لیا تھا۔

0 مشرق وسطیٰ میں اسرائیل واحد جمہوری ریاست ہے۔یہ آمریت کے سمندر میں جمہوریت کا جزیرہ ہے اس لیے ہم اس کی حمایت کرتے ہیں۔

تبصرہ

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسرائیل امریکی امداد کے سہارے زندہ ہے۔اس کے بجٹ کا دس پندرہ فی صدحصہ امریکی حکومت کی امداد اوردس پندرہ فی صد حصہ امریکی یہودی تنظیموں کی امداد پر مشتمل ہوتا ہے۔اگر ۱۹۷۳ءمیں امریکہ اسرائیل کی مدد کو نہ پہنچتا تو مصراس کوشکست دے چکا تھا۔دراصل امریکہ اپنی اندرونی سیاست کی مجبوری کی وجہ سے فلسطین کے معاملے میں دہرے معیار سے کام لے رہا ہے۔فلسطین کے معاملے میں عالم عرب کی غلطیاں اور تضادات اپنی جگہ پر،مگران کو وجہ جواز بنا کرامریکہ اپنی غلطیوں سے مبرانہیں ہوسکتا۔

اسرائیل اپنے عرب شہریوں سے جوسلوک کرتا ہے،وہ عملاً دوسرے درجے کے شہریوں والاسلوک ہے۔یہ واحد ملک ہے جہاں مذہب،کلچراورنسل ایک ہےاوراسے ایک ہی رکھنے پراصرار کیا جاتا ہے تا کہ یہ ملک ہمیشہ ایک خالص یہودی ملک رہے۔ایسا ملک دکھاوے کے لیےتو جمہوریت کا ڈرامارچا سکتا ہے،مگر حقیقت میں کبھی جمہوری ملک نہیں بن سکتا۔اگر ساری دنیا کے یہودی اسرائیل چلے جائیں (جو کہ ناممکن ہے،اس لیے کہ خوداس ریاست کی بقااوراس کو مسلسل مدد دینے کی خاطر آدھے سے زیادہ یہودیوں کا اس ملک سے باہر رہنا ضروری ہے) تب بھی یہ ایک چھوٹا سا ملک ہی رہے گا اوراس کی توسیع پسندانہ پالیسیاں بالآخراسے نقصان پہنچا کر رہیں گی۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

امریکہ جس طرح اسرائیل کی اندھا دھند حمایت کررہا ہے، یہ اس کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکا ہے۔ امریکہ کو علم ہے کہ اسرائیل کے پاس جوہری اسلحہ موجود ہے اور وہ اس کی انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں سے بھی واقف ہے۔ اس کے باوجود اسرائیل کے ہر نقصان اور اس کے بجٹ کے ہر خسارے کو امریکہ پورا کرتا ہے۔ امریکی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ سب کچھ امریکہ میں اسرائیل نواز یہودی لابی کے دباؤ کی وجہ سے ہوتا ہے۔ تاہم یہ سب کچھ سراسر ناانصافی ہے اور اگر یہی سلسلہ جاری رہا تو اس کا ردعمل بھی یقیناً جاری رہے گا۔

فلسطینیوں کی طرف سے انتفادہ کی دوسری پر تشدد تحریک اور خود کش حملے، جو ستمبر ۲۰۰۰ سے جاری ہیں، یقیناً درست حکمت عملی کے آئینہ دار نہیں ہیں۔ صبر کے ساتھ حل کا انتظار خود فلسطینیوں کے مفاد میں ہے، خواہ اس میں جتنی بھی مدت لگے۔ تاہم اس دنیا میں زیادہ تر حکمت و دانش کا اصول نہیں، بلکہ عمل اور ردعمل کا جذبہ کار فرما ہوتا ہے جس کی زد ہر ایک پر پڑتی ہے۔

امریکہ کی اسرائیل نوازی کے باوجود عالم اسلام اس مسئلے کو کیسے حل کرسکتا ہے، اس پر ہم بعد میں روشنی ڈالیں گے۔

ج۔ مسئلۂ عراق

طالبان حکومت کے خاتمے کے بعد بش انتظامیہ نے صدام حسین کو اپنا ٹارگٹ بنالیا ہے۔ امریکہ کی انتہائی خواہش ہے کہ وہ جلد از جلد عراق پر حملہ کر کے صدام انتظامیہ کی حکومت ختم کر کے وہاں اپنی پسند کی حکومت بنالے۔ اس مسئلے پر امریکی نقطۂ نظر درج ذیل ہے:

0 عراق کے پاس کیمیائی، حیاتیاتی اور وسیع تباہی پھیلانے والے دوسرے ہتھیار موجود ہیں جنھیں اس نے اپنے باشندوں کے خلاف بھی استعمال کیا ہے اور ایران کے ساتھ جنگ میں بھی استعمال کیا ہے۔ صدام ایک غیر ذمہ دار آمر ہے۔ ماضی میں اس نے کویت پر بھی قبضہ کرلیا تھا۔ یہ خدشہ ہے کہ وہ مزید ہتھیار تیار کر کے انھیں عالمی امن کو تباہ کرنے کے لیے استعمال کرسکتا ہے۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے اس پر گرفت کرنی چاہیے اور اس کی حکومت ختم کرنی چاہیے۔

اسی مسئلے پر امریکی مخالف نقطۂ نظر درج ذیل ہے:

0 دراصل امریکہ عراقی تیل کے ذخائر پر قبضہ کرنا چاہتا ہے جس کے لیے وہ بہانے تراش رہا ہے۔ ورنہ عراق نے کردوں کا قتل عام ۱۹۸۸ء میں کیا تھا۔ اب اس کا بدلہ لینے کا کیا موقع ہے۔ اسی طرح عراق نے کویت پر قبضہ ۱۹۹۰ء میں کیا تھا۔ اگر صدام برائی کی جڑ ہے تو اسے حکمرانی سے اتارنے کا صحیح وقت وہ تھا نہ کہ اب۔

0 امریکہ کا عراق پر حملہ مسلمانوں کے اندر ایک بڑے ردعمل کو جنم دے گا۔ کون نہیں جانتا کہ اسرائیل کے پاس کیمیائی اور حیاتیاتی ہتھیار تو کیا ایٹمی ہتھیار بھی موجود ہیں۔ امریکہ نے اس کا نوٹس کیوں نہیں لیا۔ خود امریکہ کے پاس بھی یہ ہتھیار موجود ہیں۔ پہلے وہ اپنے ہتھیاروں کو کیوں تلف نہیں کرلیتا؟

0 طالبان حکومت کے خاتمے کے بعد عراق پر امریکی حملے سے پوری دنیا میں یہ تاثر پختہ ہوجائے گا کہ امریکہ کے پاس

ہر مسئلے کا علاج جنگ ہے۔ یوں امریکہ کو دنیا ایک عالمی دہشت گرد کے روپ میں دیکھنے لگے گی۔ یہ خوف و دہشت کی فضا سارے عالم اور بدرجہ آخر خود امریکہ کے لیے نقصان دہ ہے۔

تبصرہ

یہ بات واضح ہے کہ امریکہ ہر قیمت پر صدام کی حکمرانی کو ختم کرنا چاہتا ہے، مگر اس کے لیے وہ اقوام متحدہ سے اخلاقی جواز ملنے کی خواہش رکھتا ہے۔ ابھی تک صدام نے (طالبان کے برعکس) اقوام متحدہ کی قراردادوں کے سامنے سر تسلیم خم کر کے امریکی حملے سے اپنے آپ کو بچایا ہوا ہے۔ راقم الحروف کے نزدیک تیل والی تھیوری کمزور ہے اور اس میں کئی جھول ہیں۔ امریکہ کو تیل کی کمی کا مسئلہ نہ آج درپیش ہے، نہ مستقبل میں ایسا کوئی امکان نظر آتا ہے۔ دراصل امریکہ کا خیال ہے کہ دہشت گردی انھی مسلمان ملکوں میں پروان چڑھتی ہے جہاں آمریت ہے۔ چونکہ تمام عرب ملکوں میں آمریت ہے، اس لیے اس کو ختم کر کے یہاں جمہوریت آنی چاہیے۔ جمہوری عمل کی ابتدا اگر عراق سے ہو جائے تو بہت جلد تمام عالم عرب اپنے آپ کو جمہوریت قبول کرنے پر مجبور پائے گا۔ امریکہ کا یہ نقطۂ نظر نہایت کمزور ہے، بلکہ اس بات کا خدشہ ہے کہ ایسے حملے کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ عراق ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا، بلکہ عالم عرب کے اندر مزید ردعمل جنم لے گا اور بعید نہیں کہ وہاں کے آمر مزید مضبوط ہو جائیں۔

یہ قوی امکان موجود ہے کہ امریکہ اقوام متحدہ کی قرارداد کا انتظار کیے بغیر عراق پر کسی بہانے سے حملہ کر دے۔ اگر اس نے ایسا کیا تو عالم اسلام کے اندر امریکی مخالف جذبات جائز طور پر اپنی انتہا کو پہنچ جائیں گے۔ ممکن ہے کہ اس حملے میں بھی امریکہ کو وقتی کامیابی مل جائے، لیکن بدرجۂ آخر یہ اس کے لیے بہت گھاٹے کا سودا ثابت ہوگا۔ البتہ اگر اس ضمن میں اقوام متحدہ کی طرف سے عراق کے خلاف متفقہ قرارداد آجاتی ہے تو پھر صورت حال مختلف ہوگی۔

عراق اپنے آپ کو کس طرح امریکی مداخلت سے بچا سکتا ہے۔ اس پر ہم بعد میں روشنی ڈالیں گے۔

د۔ پاکستان کی امریکہ سے شکایت

اہل پاکستان امریکہ سے بڑی شکایات رکھتے ہیں۔ اس ضمن میں پاکستانی دانش وروں کا نقطۂ نظر درج ذیل ہے:

0 پاکستان نے بالکل ابتدا ہی سے اپنے آپ کو امریکی کیمپ کا حصہ بنالیا تھا۔ اس کے باوجود امریکہ نے کبھی پاکستان کی حقیقی مدد نہیں کی۔ کشمیر کے مسئلے پر اس نے پاکستان کی کوئی مدد نہیں کی۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں اس نے بھارت کے ساتھ ساتھ پاکستان کے لیے بھی فاضل پرزوں پر پابندی لگا کر ہمیں ناقابل تلافی نقصان پہنچایا، اس لیے کہ امریکی اسلحہ تو صرف پاکستان کے پاس تھا۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ میں امریکہ نے بنگلہ دیش کی تخلیق رکوانے کے لیے کوئی کردار ادا نہیں کیا۔ اسی طرح جب افغانستان سے روسی افواج چلی گئیں تو امریکہ نے بعد کے مسائل سے نمٹنے کے لیے ہمیں تنہا چھوڑ کر اس خطے میں اپنی دلچسپی ختم کر دی۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اس کے مقابلے میں امریکی نقطۂ نظر درج ذیل ہے:

0 پاکستان برضا ورغبت اور اپنے فیصلے سے مغربی کیمپ کے قریب آیا تھا۔ہم نے اسے خوش آمدید کہنے کے ساتھ ساتھ ہمیشہ اسے یہ بتایا ہے کہ بھارت بھی بہت بڑا اور اہم ملک ہے۔ ہمارے اور اس کے درمیان بہت سی اقدار و روایات مشترک ہیں۔اس لیے ہم بھارت سے بھی لازماً قریبی تعلقات رکھیں گے۔

0 مسئلۂ کشمیر کے ضمن میں ہم نے اقوام متحدہ میں ہمیشہ پاکستانی موقف کی حمایت کی ہے۔ ہمارے نزدیک یہ ایک متنازع علاقہ ہے جس کا آخری فیصلہ باہمی گفت وشنید اور کشمیریوں کے حق خودارادیت ہی کے ذریعے سے ممکن ہے۔تاہم یہ مسئلہ پرامن طریقہ سے حل ہونا چاہیے۔ہم نے ہمیشہ پاکستان سے کہا ہے کہ اس مسئلے پر پاک بھارت جنگ پاکستان کے مفاد میں نہیں ہوگی۔

0 پاکستان کو ہم نے تمام اسلحہ اس شرط کے ساتھ دیا تھا کہ اسے صرف کمیونسٹ خطرے کے خلاف دفاعی طور پر استعمال کیا جائے گا۔ جب ہمیں معلوم ہوا کہ ۱۹۶۵ء میں یہ اسلحہ بھارت کے خلاف استعمال کیا جارہا ہے تو ہم نے اس کے فاضل پرزوں کی فراہمی پر پابندی لگادی۔ پاکستان نے یہ جنگ ہمارے مشورے سے شروع نہیں کی تھی۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

0 بنگلہ دیش کا قیام پاکستان کی اپنی غلطیوں، کوتاہیوں اور سیاسی عدم توازن کا نتیجہ تھا۔ وہاں کے ۹۴ فی صد عوام اپنے لیے علیحدہ ملک چاہتے تھے۔ بحیثیت ایک جمہوری ملک کے ہم اس سے کیسے نظریں چرا سکتے تھے۔ البتہ جب ہمیں معلوم ہوا کہ بنگلہ دیش کے بعد اندرا گاندھی اب مغربی پاکستان کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کا فیصلہ کر چکی ہیں تو ہمارے ہی دباؤ پر وہ اس ارادے سے باز آئیں۔

0 ہم نے کبھی اس بات کو نہیں چھپایا کہ افغانستان میں ہماری دلچسپی صرف روسی افواج کے نکلنے تک محدود ہے۔افغان مجاہد تنظیمیں پاکستان کے زیر اثر تھیں اور پاکستان نے ہی انھیں تخلیق کیا تھا۔ اگر یہ سب تنظیمیں آپس میں لڑنے لگیں اور پاکستان ان کی خانہ جنگی پر قابو نہ پا سکا یا اس میں فریق بن گیا تو اس میں ہمارا کیا قصور ہے۔

0 مثبت طور پر ہم نے پاکستان کی دوستی کی پوری قدر کی ہے۔ پاکستان ان چار ممالک میں شامل ہے جنھیں پچھلے پچاس برس میں سب سے زیادہ امریکی امداد ملی ہے۔ پاکستان کا ہر اہم پروجیکٹ براہ راست یا بلواسطہ امریکی امداد یا قرضے ہی کا مرہون منت ہے۔ پاکستان کو امریکہ کی طرف سے مہیا کردہ قرضے اکثر و بیشتر صرف ایک فیصد برائے نام سود پر دیے گئے ہیں۔اربوں ڈالر کی ناقابل واپسی امداد اس کے علاوہ ہے۔

تبصرہ

ہم پاکستانی ایک جذباتی قوم ہیں جو بین الاقوامی تعلقات میں ''کاروبار'' پر نہیں، بلکہ لو افیئر پر یقین رکھتے ہیں، اس لیے ہم ہمیشہ امریکہ سے وہ توقعات وابستہ کر لیتے ہیں جن کے پورا کرنے کا امریکہ نے کبھی کہا نہیں ہوتا۔ ہمارا خیال ہوتا ہے کہ

شاید امریکی انتظامیہ ہر وقت پاکستان ہی کے بارے میں سوچتی رہتی ہے اور امریکی صدر صبح سویرے اٹھ کر سب سے پہلے پاکستان کے اردو اخبارات کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اسی لیے تو ہر اردو اخبار میں روزانہ امریکہ پر لعن طعن کے دو تین جذباتی مضامین لازماً موجود ہوتے ہیں جن میں امریکی انتظامیہ کو ''زریں اور قیمتی'' مشوروں سے بھی نوازا گیا ہوتا ہے تا کہ وہ ان پر عمل کر کے بھارت سے لڑ کر کشمیر کو آزادی دلوا کر پاکستان کو پلیٹ میں پیش کر کے اپنی عاقبت سنوار لے۔ ہم یہ بھی سمجھتے ہیں کہ امریکہ اور مغرب ہر وقت ہمارے خلاف سازشیں کرتے رہتے ہیں۔ ہمارے ہر صدر، وزیر اعظم، چیف آف اسٹاف حتیٰ کہ وزیر خارجہ کا نام بھی وائٹ ہاؤس سے منظور ہو کر آتا ہے۔ ہر تبدیلی اور انقلاب کے پیچھے امریکہ کا ہاتھ ہوتا ہے۔ اور وہ فرد جس دن امریکہ کی نظر التفات سے محروم ہو جائے، اسی دن وہ اقتدار سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔

جب تک ہم ''محبت''، ''رد عمل'' اور ''سازش کی تھیوری'' والی نفسیات سے چھٹکارا پا کر بین الاقوامی تعلقات کو ایک کاروبار کی شکل میں نہیں دیکھیں گے تب تک امریکہ سے ہمارے گلے شکوے جاری رہیں گے۔ جس دن ہم یہ عزم کر لیں کہ ہم اپنے مسائل خود حل کریں گے، امریکہ سے تعلقات کار یقیناً رکھیں گے، مگر اس پر کلی انحصار نہیں کریں گے، وہی ہماری فریادی و احتجاجی ذہنیت کا آخری دن اور قومی وقار کا پہلا دن ہوگا۔

ر۔ دہشت گردی کے متعلق مختلف موقف

اگر چہ دہشت گردی کی کوئی متفقہ تعریف ابھی تک متعین نہیں کی جا سکی، تاہم امریکہ کی نظر میں ہر وہ مسلح عمل دہشت گردی ہے جو کسی غیر حکومتی مسلح تنظیم کی طرف سے عام لوگوں کے خلاف ہو۔ گویا اگر کوئی مقامی پرائیویٹ مسلح تنظیم اپنے کسی مقصد کے لیے خالصتاً فوجی تنصیبات پر حملے کرتی ہے تو وہ دہشت گردی نہیں۔ اسی لیے اس کے نزدیک کشمیر میں برسر پیکار ''حزب المجاہدین'' دہشت گرد تنظیم نہیں، اس لیے کہ وہ صرف مسلح افواج پر حملے کرتی ہے اور اس میں غیر مقامی لوگ نہیں۔ اس کے برعکس اس کے خیال میں ''لشکر طیبہ'' دہشت گرد تنظیم ہے، اس لیے کہ اس میں سرحد پار سے لوگ بھرتی ہوتے ہیں اور وہ غیر مسلح لوگوں کو بھی ٹارگٹ بناتی ہے۔ چنانچہ اسی معیار کے تحت امریکہ نے بہت سی تنظیموں کو دہشت گرد قرار دیا ہوا ہے۔ ان میں کچھ غیر مسلم عیسائی اور نسلی تنظیمیں بھی شامل ہیں، تاہم ان کی بڑی اکثریت القاعدہ جیسی مسلمان تنظیموں پر مشتمل ہے۔ خود یہ تنظیمیں اپنے آپ کو دہشت گرد کہلانے سے انکار کرتی ہیں۔ ان کے خیال میں وہ بہت اچھے مقاصد کے لیے مسلح جدوجہد کر رہی ہیں اور اس جدوجہد کا ایک راستہ غاصب ملک کے بظاہر عام باشندوں کا قتل بھی ہے تا کہ اس ملک کو جھنجھوڑا جا سکے۔ یہ تنظیمیں اپنے بہت سے کارکنوں کو خود کش حملوں کے لیے بھی تیار کرتی ہیں تا کہ دشمن کے ٹارگٹ پر زیادہ سے زیادہ تباہی کا مقصد حاصل کیا جا سکے۔ اس خود کشی کو وہ اعلیٰ ترین قربانی گردانتی ہیں۔ کئی ممالک ان تنظیموں کے موقف سے جزوی طور پر اتفاق کرتے ہیں۔ مثلاً پاکستان مقبوضہ کشمیر کے اندر مسلح تنظیموں کو اصلاً آزادی کی تحریکیں سمجھتا ہے۔ اسی طرح اکثر عرب ممالک ''حماس'' جیسی مسلح تنظیموں اور ان کے خود کش حملوں کو صحیح سمجھتے ہیں۔ اگر چہ ان کے خیال میں حکمت عملی کے طور پر غیر فوجی مقامات پر حملے

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

آج کے حالات میں مناسب نہیں ہیں۔

امریکہ اور دوسرے مغربی ممالک نے اس عزم کا اظہار کیا ہے کہ وہ ان تنظیموں کو جڑ سے اکھاڑ کر رہیں گے اور ان کے کسی مطالبے کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کریں گے۔ دوسری طرف ان تنظیموں کا فیصلہ ہے کہ وہ آخر دم تک اپنی جدوجہد جاری رکھیں گی۔ اس صورت حال میں ہمارے سامنے تین سوالات آتے ہیں۔ ایک یہ کہ کیا مسلح تنظیموں سے مقابلہ کرنے کا امریکی طریقہ صحیح ہے؟ دوسرا یہ کہ کیا ان تنظیموں کے غیر مسلح لوگوں پر حملے اور خود کش جتھوں کی تیاری ایک صحیح طرز عمل ہے؟ تیسرا یہ کہ اگر امریکہ اور ان تنظیموں، دونوں کی رائے صحیح نہیں ہے تو پھر صحیح طرز عمل کیا ہے؟

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ جب تک ان تنظیموں کے قیام کے پیچھے اصل وجوہات و محرکات کا تجزیہ کر کے ان کا حل نہیں لایا جائے گا، تب تک ان کی سرگرمیاں کسی نہ کسی شکل میں جاری رہیں گی۔ ممکن ہے امریکہ موجودہ لہر پر قابو پا لے، مگر ان تنظیموں کی راکھ سے نئی نئی کونپلیں پھوٹیں گی۔ عالم اسلام کے اندر ان تنظیموں کے نمو پانے کی اصل وجوہات غربت، غیر جمہوری حکومتیں اور اسرائیل کا ظلم و ستم ہیں۔ امریکہ کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ مسئلۂ فلسطین کے ایک معقول اور قابل عمل حل (جو آج کے حالات میں پورے غزہ، اور عرب اردن بشمول مشرقی یروشلم و بیت المقدس پر مشتمل فلسطینی ریاست کا قیام ہے) کو پیش کر کے پہلے اس پر امریکی یہودیوں سے اتفاق رائے حاصل کرے اور پھر اپنی سفارت کاری سے کام لے کر اس پر اسرائیل کو قائل کرے۔ اگر امریکہ عالم اسلام کے اندر اپنے انتہائی منفی امیج کو کچھ بھی بہتر کرنا چاہتا ہے تو اسے ایسا کرنا پڑے گا۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ مسلح تنظیمیں خواہ کتنے ہی اعلیٰ مقاصد اور خلوص کے ساتھ اپنی جدوجہد کر رہی ہوں، تاہم تاریخ کا بھی یہ فیصلہ ہے اور انسانی ضمیر بھی اس پر شاہد ہے کہ غیر مسلح لوگوں کو مارنے کا فعل غلط ہے۔ اس سے دوسری قوم میں انتقام اور ردعمل پیدا ہوتا ہے۔ جذباتیت پروان چڑھتی ہے۔ گفتگو اور مکالمہ ممکن نہیں رہتا۔ تاریخ اس پر شاہد ہے کہ پر امن، مظلومانہ، عدم تشدد اور قومی اتحاد پر مبنی جدوجہد ہمیشہ کامیاب رہی ہے۔ جب کہ متشدد اور متفرق جدوجہد اکثر و بیشتر ناکامی سے دوچار ہوئی ہے۔ آج اہل فلسطین اور اہل کشمیر، دونوں بیسیوں سیاسی اور مسلح تنظیموں میں بٹے ہوئے ہیں۔ بھلا ایسی جدوجہد کیسے کامیاب ہو سکتی ہے؟ آج اگر اہل فلسطین اور اہل کشمیر ایک سیاسی تنظیم کے تحت منظّم ہو جائیں۔ اپنی علیحدہ علیحدہ بیسیوں شناختیں ختم کر دیں اور خالصتاً پر امن جدوجہد شروع کر دیں تو چند سال کے اندر اندر بغیر کسی بیرونی مدد کے کامیاب ہو سکتے ہیں۔ مسلح تنظیموں کی حرکت ان کی آزادی کو دور تو کر سکتی ہے، قریب نہیں لا سکتی۔

اسی طرح خود کش جتھے ترتیب دینے کا نقصان بھی اسی قوم کو ہوتا ہے۔ خودکشی کے لیے وہی فرد تیار ہوتا ہے جو انتہائی پر عزم، باصلاحیت اور قربانی کے جذبے سے سرشار ہو، جب کہ ان حملوں میں مرنے والے مخالف قوم کے لوگ تو بس عام افراد ہوتے ہیں جو اتفاق سے لقمۂ اجل بن جاتے ہیں۔ جب قوم کے باصلاحیت اور پر عزم نوجوان ان حملوں میں کام آ جائیں تو

اوسط درجے کے لوگ ہی پیچھے بچتے ہیں۔ جاپان نے بھی دوسری جنگ عظیم میں اپنے پائلٹوں کو دشمن کے بحری جہازوں سے ٹکرا کر ایسا ہی غلط فیصلہ کیا تھا جس کے نتیجے میں اس کے پاس پائلٹوں کی شدید قلت ہوگئی تھی۔ چنانچہ یہ بھی کوئی صحیح حکمت عملی نہیں ہے۔

تیسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ امریکہ سے مطلوب رویے کی بات تو ہم نے محض بر سبیل تذکرہ کی۔ امریکہ بھلا ہماری بات کیوں مانے گا۔ ہمارا اصلی مقصد تو اپنی قوم اور اپنی امت کو حکمت و تدبیر کا راستہ سمجھانا ہے۔ ایسا راستہ جس پر چل کر وہ حالیہ مصیبت سے نکل جائیں اور ایک بہتر مستقبل کی طرف گامزن ہو جائیں۔ چنانچہ یہ جواب اگلے صفحات پر تفصیل سے آئے گا۔

امریکہ کے ساتھ تعلقات کار کے تقاضے

پچھلے باب میں ہم نے ان تمام دلائل کا مختصراً جائزہ لیا تھا جو مختلف نقطہ ہائے نظر کی طرف سے اس سوال کے جواب میں پیش کیے جا رہے ہیں کہ کیا امریکہ عالم اسلام کا دوست ہے یا دشمن یا وہ اس کے ساتھ محض تعلقات کار رکھنا چاہتا ہے۔ یہ ہر انسان کے رجحان، ذہنی افق اور افتاد طبع پر منحصر ہے کہ وہ ان میں کون سے دلائل کو زیادہ وزنی تصور کرتا ہے۔ جہاں تک راقم کا تعلق ہے، اس کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ''امریکہ مسلمان ملکوں کے ساتھ تعلقات کار رکھنا چاہتا ہے بشرطیکہ ان میں سے کوئی اس کے سپر پاور ہونے کی حیثیت کو چیلنج نہ کرے۔'' ہمارے اس نقطۂ نظر کے دلائل درج ذیل ہیں:

0 سپر پاور کی نفسیات ہمیشہ سے یہ رہی ہے کہ وہ اس پوزیشن پر برقرار رہے۔ اس لیے امریکہ کی نفسیات بھی یہی ہے۔

0 پچھلے ہزار برس کی تاریخ میں جتنی لڑائیاں عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان لڑی گئی ہیں، اتنی ہی لڑائیاں خود عیسائی طاقتوں نے آپس میں اور مسلمان ملکوں نے آپس میں لڑی ہیں۔ گویا مختلف لڑائیوں اور قضیوں میں مذہب ایک عامل تو رہا ہے، مگر واحد عامل کبھی نہیں رہا۔

0 پچھلے تین چار سو برس میں بزور و جبر مذہب تبدیل کرانے کا رجحان ختم ہو گیا ہے۔ مثلاً جب انگریز برصغیر میں آئے تو صرف شودروں نے عیسائیت قبول کی۔ ان کو بھی انگریزوں نے کوئی زیادہ وقعت نہیں دی، بلکہ ان کو محض صفائی ستھرائی کے کام پر لگا دیا۔

0 غیر مسلم طاقتیں اچھی طرح جانتی ہیں کہ مسلمانوں کی تعداد بدترین غلامی کے دور میں بھی کبھی کم نہیں ہوئی تو اب یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک سو بیس کروڑ مسلمانوں سے جان چھڑائی جائے۔

0 اب کسی بھی ملک کے لیے کسی بھی قوم کو لمبے عرصے تک جسمانی طور پر غلام بنانا ممکن نہیں رہا۔ تاوقتیکہ وہ قوم عددی طور پر بہت ہی چھوٹی ہو یا وہ مختلف ملکوں میں بٹی ہوئی ہو۔ اب نہ صرف مختلف ملکوں، بلکہ نسلی وحدتوں پر مشتمل صوبائی بارڈرز کو بھی ایک تقدس حاصل ہو گیا ہے۔ اس لیے اب کسی ملک کے لیے یہ ممکن نہیں رہا کہ وہ مسلمانوں کو علاقائی طور پر غلام بنا لے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

0 امریکہ کی پچھلی تاریخ اس بات کو ثابت کرتی ہے کہ اس کی ترجیحات میں مذہب کو کوئی بڑا مقام حاصل نہیں ہے، سوائے اسرائیل کی انتہائی ناجائز حمایت کے۔ اس نے افریقہ اور لاطینی امریکہ کے غریب عیسائی ملکوں کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ اس نے کئی ایسی خانہ جنگیوں میں کوئی خاص حصہ نہیں لیا جہاں ایک طرف عیسائی غالب اکثریت میں تھے اور دوسری طرف مسلمان تھے۔

0 امریکہ نے صرف ان مسلمان ملکوں سے مخاصمت مول لی ہے جہاں اس کے سٹریٹیجک مفادات کو کوئی لازمی خطرہ لاحق ہوا یا جہاں مداخلت سے اسے کچھ اضافی فوائد حاصل ہو سکتے تھے۔ مثلاً ایران عراق جنگ میں مداخلت اسے کوئی فائدہ نہیں تھا، اس لیے اس نے مداخلت نہیں کی۔ اس کے برعکس عراق کویت جنگ میں مداخلت سے اس کو بڑے فائدے متوقع تھے، سو اس نے مداخلت کر لی۔ اسی طرح بوسنیا اور کوسووو کے مسائل میں مداخلت اس کے لیے فوائد کا باعث تھی، چنانچہ اس کی مداخلت سے یہ دو مسلمان ملک معرض وجود میں آئے۔

0 امریکہ اس دنیا کا، خدانخواستہ کوئی قادر مطلق نہیں ہے۔ نہ وہاں سپر مین بستے ہیں۔ وہاں کے نظام اور وہاں کے انسانوں میں بھی بڑی کمزوریاں اور جھول ہیں۔ وہ چاہیں بھی تو اپنی ٹیکنالوجی کی مدد سے نہ پوری دنیا کو غلام بنا سکتے ہیں، نہ اس پر قبضہ جما سکتے ہیں۔ امریکی اس حقیقت کو اچھی طرح جانتے ہیں۔

0 کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کی ایجاد سے اب ٹیکنالوجی کسی کی اجارہ داری نہیں رہی۔ امریکی اس حقیقت کو بھی اچھی طرح جانتے ہیں۔ جلد یا بدیر ہر کوئی محنت، عزم اور ثابت قدمی کے ساتھ ٹیکنالوجی کی ہر رفعت کو پا سکتا ہے۔

0 امریکہ کے اندر اسلام کی دعوت و اشاعت پر کوئی قدغن نہیں ہے۔ وہاں اسلامی ادارے اس حد تک آزادی سے کام کر رہے ہیں جس کا وہ مسلمان ممالک میں تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اسی لیے ہر سال وہاں ہزاروں لوگ مسلمان ہو رہے ہیں۔ اور امریکہ کی طرف سے اس میں کوئی رکاوٹ کھڑی نہیں کی جا رہی۔

0 بین الاقوامی تعلق اب اصلاً ایک کاروباری تعلق بن گیا ہے جس میں پائداری مفادات اور تجارت کے اشتراک سے آتی ہے۔ ہر ملک بنیادی طور پر اپنی ہی ترقی اور بقا کے لیے سوچتا ہے اور اسی سے تعلق رکھتا ہے جس سے تعلق اس کی مادی ترقی اور بقا کے لیے مفید ہو۔

درج بالا نکات کی بنیاد پر ہماری رائے یہ ہے کہ امریکہ ہر ممکن حد تک مسلم ممالک سے تعلقات کار رکھنا چاہتا ہے۔

ہمارا رویہ کیا ہونا چاہیے

اگر امریکہ ہم سے تعلقات کار رکھنا چاہتا ہے تو پھر ہمیں بھی چاہیے کہ ہم اس کے ساتھ تعلقات کار رکھیں اور اس تعلق کو زیادہ سے زیادہ اپنے فائدے کے لیے استعمال کریں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم بنیادی طور پر امن پسند لوگ ہیں۔ ہم جیو اور جینے دو کی پالیسی پر یقین رکھتے ہیں۔ ہم پرامن بقائے باہمی کے علم بردار ہیں۔ ہم ہر گروہ کا یہ حق تسلیم کرتے ہیں کہ وہ جمہوری

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اصولوں کے تحت اپنے ضمیر کے مطابق دوسروں کو نقصان پہنچائے بغیر اپنی زندگی کا راستہ متعین کرے۔ اگر ہماری نظر میں یہ راستہ غلط بھی ہو تب بھی ہمیں کسی پر اپنی مرضی مسلط کرنے کا حق نہیں ہے۔ جس طرح ہم یہ نہیں چاہتے کہ کوئی جبراً اپنے خیالات ہم پر ٹھونسے، اسی طرح ہم یہ بھی نہیں چاہتے کہ اپنے خیالات دوسروں پر بزور مسلط کریں۔ اس لیے اگر کوئی ہمارے ساتھ امن سے رہنا چاہتا ہے تو ہمیں بھی چاہیے کہ اس کے ساتھ امن سے رہیں۔ ان تعلقات کار سے ہمیں درج ذیل فوائد حاصل ہوں گے:

0 ایک یہ کہ ہم امریکہ سے سائنس اور ٹیکنالوجی سیکھ سکیں گے۔ ان کے تجربات سے فائدہ اٹھا کر ہم اپنی قوم کو ترقی دے سکیں گے۔

0 ان کے ساتھ تجارتی تعلقات مضبوط بنانے سے ہماری اقتصادی حالت مضبوط ہو گی۔

0 باہمی روابط بڑھنے سے ہم ان سے اور وہ ہم سے اچھی اقدار سیکھ سکیں گے۔ باہمی تعلق کی وجہ سے یہ بھی ممکن ہو گا کہ ہم ان کی بری چیزوں کو حکمت کے ساتھ اپنے ہاں آنے سے روک سکیں۔

0 ہمارے لیے امریکہ میں اسلام کی تبلیغ واشاعت مزید آسان ہو جائے گی۔ ہم ان کے سامنے انسان دوست اور معتدل حقیقی اسلام کا چہرہ بڑی خوبصورتی سے پیش کر سکیں گے۔

0 بین الاقوامی تنازعات میں ہم امریکیوں کی مزید حمایت حاصل کر سکیں گے۔ اور وہ بیشتر معاملات میں ہم سے مشورہ کرنے پر مجبور ہوں گے۔

تعلقات کار کے تقاضے

تعلقات کار کا مطلب نہ کسی کی غلامی ہے، نہ اس کی ہر جائز و ناجائز بات ماننا اور نہ اس پر کامل انحصار کرنا ہے، بلکہ اس کا مطلب ہے اپنے ملک کو متحد رکھتے ہوئے باوقار طریقہ سے دوسرے ملک سے تعلق اور اس کے ساتھ تمام چھوٹے بڑے تنازعات کو باہمی گفت وشنید اور مکالمے سے حل کرنا۔ تاہم دوسروں سے خصوصاً امریکہ سے تعلقات کار رکھنے کے لیے خود ہمارے ہاں چند بنیادی امور کی موجودگی نہایت ضروری ہے۔ اگر یہ موجود نہ ہوں تو پھر تعلق کسی کام کا نہیں رہتا۔ اور اگر یہ موجود ہوں تو پھر ہر تعلق سے اپنے قومی مفادات کے لیے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

0 ہمارے اپنے ہاں ہر مسلم ملک میں اندرونی قومی اتحاد ہونا چاہیے۔ موجودہ حالات میں قومی اتحاد صرف اور صرف بھر پور جمہوری کلچر کے ذریعے سے ممکن ہے۔

0 ہمارے ہاں ترقی کرنے کی امنگ اور جذبہ ہونا چاہیے۔ یہ اجنبی لیکن بالکل صحیح بات ہے کہ مسابقت کا جذبہ بھی جمہوری کلچر ہی کے ذریعے سے پروان چڑھتا ہے۔

0 ہمارے ہاں ہر ملک کے اندر آزادانہ مکالمے کا کلچر ہونا چاہیے۔ جس میں ہر بات کو دلیل کے ساتھ سنا اور سمجھا جائے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اور دلیل ہی کی بنیاد پر بات کی جائے جذباتی انداز فکر، جذباتی گفتگو اور نعرے بازی مکالمے کے کلچر کو ختم کر کے رکھ دیتی ہے۔

0 دنیا کے تمام ملکوں خصوصاً ہمسایہ ممالک سے بات چیت کے دروازے کھلے رکھے جائیں۔

0 ہر معاہدے کی لفظ و معنی کے ساتھ پابندی کی جائے۔تا کہ کسی کو یہ موقع نہ ملے کہ وہ ہم پر مختلف الزامات لگا کر ہمارے خلاف کوئی اقدام کرے۔

واضح رہے کہ امریکہ کی طرف سے مسلمان ملکوں سے تعلقات کار رکھنے کی پالیسی کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ہمارے اور اس کے تعلقات میں کوئی کھنچاؤ آئے گا ہی نہیں۔ایسا کھنچاؤ تو مختلف معاملات میں لازماً آئے گا۔ بین الاقوامی طور پر امریکہ ایسے کام کرے گا جن سے اتفاق ہمارے لیے ناممکن ہوگا۔ایسے موقع پر دلیل کے ساتھ باوقار اختلاف رائے ضرور کیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ہمارا اپنا گھر صحیح ہو، ہمارے ہاں جمہوریت، مکالمے کا کلچر اور انصاف ہو تو امریکہ کے لیے ہمارے ساتھ اختلاف رائے کو نظر انداز کرنا آسان نہیں ہوگا۔

اسی طرح امریکہ کبھی یہ نہیں چاہے گا کہ مسلمان ممالک اسلحہ سازی کی انڈسٹری میں ترقی کریں۔اسی لیے کہ اس سے اس کے سپر پاور ہونے کی حیثیت کو خطرہ لاحق ہونے کا اندیشہ ہے۔کچھ مسلمان ممالک اس سٹریٹیجک پوزیشن میں ہیں کہ وہ اسلحہ سازی کی صنعت میں آگے بڑھ سکتے ہیں۔ بین الاقوامی قوانین کی پابندی کرتے ہوئے ایسا کیا جا سکتا ہے۔جو ممالک اس پوزیشن میں نہیں، وہ ٹیکنالوجی کے دوسرے میدانوں میں اپنی توجہ مرتکز کر سکتے ہیں۔ایک راستہ بند ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ بار بار دیوار سے سر ٹکرایا جائے۔متبادل راستے ہر وقت اور ہر حالت میں موجود ہوتے ہیں۔جرمنی اور جاپان کی مثال ہمارے سامنے ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اگر امریکہ ہمارا دشمن ہے تو......

یہ بھی تو ممکن ہے کہ ہماری یہ رائے کہ امریکہ عالم اسلام سے تعلقات کار رکھنا چاہتا ہے، غلط ہو۔اور اس کے برعکس امریکہ کی اصل پالیسی یہ ہو کہ عالم اسلام کو زیادہ سے زیادہ مغلوب، کمزور اور پس ماندہ رکھا جائے۔مسلمان ملک ہمیشہ اس کے سامنے محتاج رہیں۔ جہاں جہاں ان کو جس کے ہاتھوں سزا دینی ممکن ہو وہ دی جائے۔ان میں سے جو بھی ملک سر اٹھانے کی کوشش یا جرأت کرے، اسے فوراً کچل دیا جائے۔اقتصادی طور پر ان کو ہمیشہ تنگ دست اور بد حال رکھنے کی کوشش کی جائے۔اگر ان کو جسمانی طور پر ختم نہ کیا جا سکے تو کم از کم ان کو ہمیشہ نیم غلامی کی کیفیت میں رکھا جائے۔ان کو پیش آمدہ مسائل حل نہ کیے جائیں، بلکہ ان کو معلق رکھا جائے حتیٰ کہ وہ کافی حد تک لاینحل بن جائیں۔ان کے وسائل پر ملفوف قبضہ برقرار رکھا جائے۔ان کو ایک دوسرے سے لڑایا جائے۔اسی پالیسی کے تحت پہلے طالبان کو کچل دیا گیا۔اب عراق کی باری ہے۔عراق

کے بعد ایران کا نمبر آئے گا اور ممکن ہے کہ اس کے بعد پاکستان سر فہرست ہو جائے۔ مسلمانوں کی تیل کی دولت پر اصلاً امریکیوں کا قبضہ ہو اور اگر مسلمان ممالک امریکیوں کے تابع ہو کر زندگی گزارنے پر قانع ہوں تب تو ٹھیک ورنہ ان کو بزور ان کی حیثیت یاد دلائی جائے۔ صرف یہی نہیں، بلکہ مسلمان ممالک کی اقدار بدل کر ان کو ہر ممکن طریقہ سے امریکی انداز میں ڈھالا جائے اور انھی حکومتوں سے تعلق رکھا جائے جو اس کے رنگ میں رنگ جانے کے لیے تیار ہوں۔

درج بالا نقطۂ نظر بھی قابل غور ہے، بلکہ اس کو ہمیشہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے، اس لیے کہ بہرحال ہمیں امریکہ کے اصل مقاصد کا تو علم نہیں ہے۔ ایسا بھی ممکن ہے کہ امریکہ کے اندر طاقت کے کچھ مراکز، ورکنگ ریلیشن شپ والا نقطۂ نظر رکھتے ہوں اور کچھ بالادستی اور غلبے کا مقصد رکھتے ہوں۔

اب ہمیں اس انداز سے غور کرنا ہے کہ اگر بالفرض امریکہ ہم سے دشمنی پر تلا ہوا ہو تو ہماری حکمت عملی کیا ہونی چاہیے۔ ہمیں کس طرح اس کی چالوں کو ناکام بنانا ہے اور ہمیں وہ کون سے متبادل اقدامات کرنے ہیں جن سے ہم نہ صرف اس کے شر سے بچ سکیں، بلکہ ترقی کے راستے پر آگے بھی بڑھ سکیں۔ اس ضمن میں تین امور بہت اچھی طرح سمجھ لینے چاہییں۔

امریکہ کی طاقت اور طاقت کی اہمیت

یہ امر مسلمہ ہے کہ اس وقت امریکہ دنیا کے اندر سب سے ترقی یافتہ ملک ہے۔ ٹیکنالوجی، سائنسی تحقیق، جنگی صنعت اور طاقت میں اس کا کوئی ثانی تو کیا پاسنگ بھی نہیں۔ سوائے چین کے دنیا کے تمام ترقی یافتہ ممالک اسی کے خوشہ چین، اس کی ہاں میں ہاں ملانے والے، اس کی نقالی پر فخر کرنے والے اور اسی کے کلچر کو اپنانے والے ہیں۔ آبادی کے اعتبار سے دنیا کی مزید دو طاقتیں یعنی چین اور بھارت بھی تیزی سے اس کا کلچر اپنانے کے راستے پر جا رہی ہیں۔ سلامتی کونسل کے باقی تمام اراکین کو کچھ ردوکد کے بعد چار و ناچار اس کے موقف کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑتا ہے۔ امریکہ کی منفرد جغرافیائی پوزیشن، آبادی کی ساخت اور آزاد کلچر نے اس کی ترقی اور طاقت کو مزید مہمیز دی ہے۔

اس دنیا میں ہمیشہ طاقت کی بڑی اہمیت رہی ہے۔ ایسے ادوار کی تعداد آٹے میں نمک سے بھی کم ہے جب طاقت کے بجائے خالصتاً انصاف کی حکمرانی اندرون ملک اور بیرونی تعلقات کار کے ضمن میں رہی ہو۔ بیرونی تعلقات کار کے ضمن میں وہی ممالک ان مسائل میں انصاف کا ڈھونگ رچاتے ہیں جن سے ان کا کوئی مفاد وابستہ نہ ہو۔ پچھلے ہزار برس میں شاید ایک بھی ایسی مثال پیش نہ کی جا سکے جب کسی ملک نے بین الاقوامی تعلقات میں مستقلاً خالصتاً انصاف کا وطیرہ اپنایا ہو۔ ایک امریکہ ہی پر کیا موقوف ہر جگہ ایسا ہی ہے۔ جس طرح ہمارے ہر گاؤں میں خان، جاگیردار اور وڈیرے کو ویٹو پاور حاصل ہوتی ہے، اسی طرح اقوام متحدہ میں بھی پانچ وڈیروں کو ویٹو پاور حاصل ہے۔ جب اس اصول کو ساری دنیا نے تسلیم کیا ہوا ہے تو اس کا مطلب یہی ہے کہ طاقت کی اہمیت کا اصول مسلمہ ہے۔ اس لیے جو کوئی بھی اس دنیا میں اثر و رسوخ کا حامل بننا چاہتا ہو، اس کے لیے لازم ہے کہ وہ طاقت کے حصول پر توجہ دے اور کم از کم اتنی طاقت حاصل کرے کہ وہ طاقت ور ترین ملکوں کے

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ساتھ برابری کی سطح پر بات کر سکے۔

عالم اسلام کی زبوں حالی اور اس کا دہرا معیار

ہر معیار کے اعتبار سے عالم اسلام اس وقت بدحالی، کمزوری، نااتفاقی، بدانتظامی، اور بے انصافی کی آخری حد پر ہے۔ تمام عالم اسلام کی مجموعی قومی آمدنی (تیل والے ممالک کی آمدنی سمیت) ترقی یافتہ ممالک میں سے کسی ایک ملک کی آمدنی سے بھی کم ہے۔ سوائے ملائیشیا کے کسی ملک کی کوئی خاص صنعتی بنیاد نہیں۔ چند افریقی ممالک کو چھوڑ کر ہمارے ہاں تعلیم سب سے کم ہے۔ صحت کی سہولتوں کا بھی یہی حال ہے۔ پورے عالم اسلام میں سے کسی ملک میں مضبوط ادارے موجود نہیں ہیں۔ دفاعی صنعت کے اعتبار سے صرف پاکستان کے پاس نیوکلیئر ٹیکنالوجی موجود ہے۔ ہوائی جہاز، ٹینک، توپ، آب دوز، بحری جہاز، ریڈار، بکتر بند گاڑیاں اور اس نوعیت کی دیگر تمام چیزوں کے لیے مسلمان دوسروں کے محتاج ہیں۔ ایک سعودی عرب کے علاوہ، باقی مسلمان ملکوں میں انصاف نام کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔ سعودی عرب کا انصاف بھی اپنے ملک کے باشندوں کے لیے کچھ اور، اور دوسروں کے لیے کچھ اور ہے۔ ہم مسلمان ہر وقت مغرب پر دہرے معیار کا الزام لگاتے ہیں۔ یقیناً یہ الزام اس حد تک صحیح ہے کہ مغربی اور ترقی یافتہ ممالک اپنے اندرونی نظام میں تو نہیں، لیکن بیرون ملک تعلقات کے ضمن میں قابل مذمت اور دہرے معیار سے کام لیتے ہیں۔ تاہم سوال یہ بھی ہے کہ کیا ہم نے اس ضمن میں اپنے ممالک کا جائزہ لیا ہے۔ اگر غیر جانب دارانہ تجزیہ کیا جائے تو یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ مسلمان ممالک اندرونی اور بیرونی، دونوں اعتبارات سے بدترین دہرے معیار سے کام لیتے ہیں۔ سارے مسلمان ملکوں میں سے اس وقت صرف بنگلہ دیش کے اندر پچھلے دس برس سے جمہوریت قائم ہے۔ اس کے علاوہ ملائیشیا اور انڈونیشیا میں کسی حد تک جمہوریت ہے۔ ایران میں انتخابات ہوتے ہیں، مگر اصل اختیار غیر منتخب قوتوں کے پاس ہے۔ ترکی میں بھی انتخابات ہوتے ہیں، مگر طاقت کا سرچشمہ فوج ہے۔ پاکستان کی صورت حال تو ہم سبھی کے سامنے ہے۔ جہاں تک عرب ممالک کا تعلق ہے تو وہاں یا بدترین فوجی آمریتیں ہیں یا خاندانی بادشاہتیں ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جو حکمران خود اپنے عوام کو اپنے ملکی معاملات میں دخیل ہونے کا حق نہیں دیتے۔ جہاں عوام کی حیثیت رعایا سے زیادہ کچھ نہیں، وہ لوگ اپنا گھر ٹھیک کرنے سے پہلے دوسروں پر کیسے دہرے معیار کا الزام لگا سکتے ہیں۔ مسلمان ملکوں میں کہیں بھی عدل اجتماعی نہیں۔ احتساب کا اور احتسابی اداروں کا کوئی تصور ہی نہیں۔ حکمران ہر طرح کے قوانین سے بالاتر ہیں۔ مشرق وسطیٰ کے تیل کی ساری آمدن درحقیقت حکمران کی ذاتی آمدن ہوتی ہے۔ حکمران خاندانوں اور حکمران طبقوں کے لیے بالکل علیحدہ قوانین ہیں اور عام انسان کے لیے بالکل علیحدہ۔ مثلاً سعودی شاہی خاندان کے چھتیس ہزار اراکین کو ساری دنیا میں لامحدود مفت سفر کی سہولت حاصل ہے۔ یہی حالت تیل پیدا کرنے والے تمام باقی ممالک کی ہے۔ چند امیر مسلمان ممالک کو چھوڑ کر باقی ملکوں میں مفلوک الحال نچلے طبقے کی صورت حال بہت ناگفتہ بہ ہے۔ زندگی کی بنیادی سہولیات تک بھی ان کی رسائی نہیں۔ تعلیم، صحت، رہایش اور روزگار تک محض خوش قسمت کی

رسائی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ان مقاصد کے حصول کے لیے رقم میسر نہیں، بلکہ پیسہ ہے، مگر وہ غلط ترجیحات، مخالفین کو دبانے اور حکمران طبقے اور ان کے چہیتوں کے کام آتا ہے۔

مسلمان ملکوں نے بلحاظ مجموعی صنعتی ترقی کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ ہمارے یہاں سائنس دانوں کی تعداد بہت کم ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی ہماری ترجیحات میں شامل نہیں ہیں۔ پچھلے سو برس میں شاید کسی مسلمان ملک کے ہاں کوئی نئی ایجاد نہیں ہوئی ہوگی۔ اسی لیے ہمیں ہر چیز میں مغربی ممالک کا محتاج ہونا پڑتا ہے۔ چنانچہ اگر وہ ہماری محتاجی کا فائدہ اٹھائیں، ہم پر اپنی شرائط مسلط کریں اور ہمارا بازو مروڑنے کی کوشش کریں تو اصل قصور ہمارا ہے یا ان کا؟

مسلمان ملکوں میں عام طور پر رشوت، کرپشن، سفارش، عیاشی اور کام چوری کا کلچر ہے۔ ہمارے امیر طبقے نے اپنی دولت کا بہت کم حصہ کمزور طبقے کے لیے مختص کیا ہے، اور وہ بھی عجیب ترجیحات کے ساتھ۔ مثلاً امارات کے امیر شیخ آکر پاکستان اور بنگلہ دیش میں عظیم الشان مساجد تعمیر کر لیتے ہیں۔ حالانکہ ان کا سرمایہ یہاں مسجدوں میں نہیں، بلکہ کارخانوں میں لگنا چاہیے۔ مسجد تو ہر بستی کے مسلمان اپنے معاشی حالات کے مطابق لازماً تعمیر کر ہی لیتے ہیں۔

ہمارے عام لوگوں کی ترجیحات بھی کسی زندہ قوم کے شایان شان نہیں۔ ہم اپنے بچوں کی تعلیم کے بجائے شادی بیاہ اور دوسری تقریبات میں دکھاوے پر زیادہ رقم خرچ کرتے ہیں۔ ہم وقت کی قدر کرنا نہیں جانتے، اس لیے ہماری ایک بڑی تہذیبی قدر مسلسل غمی شادی میں شریک ہونا ہے۔ ہمارے یہاں کسی بڑے جنازے کو اپنے بہت فخر اور دوسرے بہت قدر اور رشک کی نظر سے دیکھتے ہیں، خواہ اس میں قوم کے کتنے ہی قیمتی دن ضائع ہو جائیں۔

ہم لوگ بے حسی، خود غرضی، لاپروائی اور غیر ذمہ داری کے آخری مقام پر ہیں۔ سوائے پاکستان کے، اکثر مسلمان ممالک اپنے دفاع کی مطلوبہ صلاحیت نہیں رکھتے۔ مشرق وسطیٰ کے مسلمان ممالک کو محض اس لیے کوئی اپنا غلام نہیں بنا رہا کہ کسی کو اس کی ضرورت نہیں۔ ورنہ جو بھی ملک چاہے وہ چند دنوں کی لڑائی میں انھیں زیر کر سکتا ہے۔

مسلمان ممالک آپس میں پالیسیوں کی اعتبار سے بھی بالکل منتشر، غیر متفرق اور مختلف الخیال ہیں۔ ایک فلسطین کے متعلق کسی حد تک ذہنی ہم آہنگی موجود ہے، مگر اس کا معاملہ بھی یہ ہے کہ مصر کے مرحوم صدر سادات نے اسرائیل سے مذاکرات کے ذریعے سے صحرائے سینا کو واپس لے لیا اور غزہ کا فلسطینی علاقہ بدستور اسرائیل کے کنٹرول میں رہنے دیا، حالانکہ وہ علاقہ اسرائیل نے مصر سے ہی چھینا تھا۔ اسی طرح فلسطینیوں اور اردن کی آپس کی دشمنی سے ایک دنیا واقف ہے۔ شام اور فلسطینیوں کے درمیان بھی کئی اختلافات ہیں۔ ایک مدت سے پوری عرب دنیا نے عملاً فلسطینیوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا ہوا ہے۔ خود فلسطینیوں کا یہ حال ہے کہ وہ بیسیوں تنظیموں میں بٹے ہوئے ہیں جن کے درمیان وسیع اختلافات پائے جاتے ہیں۔

عالم اسلام کی یہ بھی عجیب صورت حال ہے کہ پاکستانی عوام کی ایک بھاری اکثریت عراق اور فلسطین کی حامی ہے اور ہماری حکومتوں نے ہمیشہ ان کی حمایت کی ہے، مگر صدام حسین ہوں یا یاسر عرفات، دونوں کشمیر کے معاملے میں بھارت کے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

حامی ہیں۔اوران دونوں مما لک کے عوام بھی پا کستان کی بہ نسبت بھارت کے حامی اور دوست ہیں۔

یہ ہے عالم اسلام کی زبوں حالی، کمزوری، نا اتفاقی اور دہرے معیار کا ایک مختصر خا کہ۔اس حالت کے ساتھ تو ہمارا محض زندہ رہنا بھی ایک بڑی باعث حیرت بات ہے، کجا یہ کہ ہم یہ سوچ سکیں کہ اپنی اس حالت کو بدلے بغیر ہم دنیا کے ترقی یافتہ مما لک کے ہم پلہ بن سکیں گے، ان کا مقابلہ کرسکیں گے اوران کی سازشوں کا توڑ کرسکیں گے۔ایسا ممکن نہیں ہے۔ پہلے ہمیں اپنے گھر کو ہر اعتبار سے ٹھیک کرنا ہوگا تب کہیں جا کر ہم آگے کا سوچ سکیں گے۔

جذباتی نعرے، کھوکھلے دعوے، غلط اقدامات اور فضول جنگیں

عالم اسلام کے حکمران ہوں یا سیاسی لیڈر، دانش ور ہوں یا مذہبی واعظ، صحافی ہوں یا کالم نگار، سب کے سب جذباتی الفاظ و اصلاحات استعمال کرنے، جذباتی تقریریں اور کالم لکھنے اور ہر وقت عوام کو ایک سحر کے عالم میں رکھنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔عوام بھی اس انداز کو پسند کرتے ہیں۔ ہر مقرر اپنی تقریر میں یوں سماں باندھتا ہے جیسے پوری دنیا بس ہمارے ایک ہی وار کی زد میں ہے۔ ہر کالم نگار رائی کو یوں پہاڑ بناتا ہے کہ ہر نوجوان کا جی چاہتا ہے کہ ابھی اٹھ کر عالم کفر کو للکار کر تخت یا تختہ میں سے کسی کا انتخاب کر لے۔ ماضی کے کسی بھی واقعے کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کرنے کے بجائے اس کو افسانہ طرازی کے انداز میں یوں پیش کیا جاتا ہے گویا مسلمانوں سے کبھی کوئی غلطی ہوئی ہی نہیں۔

ہمارے لیڈر ہماری ہر خواہش اور جذبے کو نعرے کی صورت دے کر دلوں کو گرماتے ہیں چاہے وہ نعرہ یا دعویٰ کتنا ہی کھوکھلا کیوں نہ ہو۔ ''اب روس کے بعد امریکہ کی باری ہے''، ''ہم دہلی کے لال قلعہ پر سبز ہلالی پرچم لہرا کے رہیں گے''، ''سارا ہندوستان مسلمان ہونے والا ہے''، ''گرتی ہوئی دیواروں کو ایک دھکا اور دو''۔اس طرح کے نعرے پاکستان میں عام سنائی دیتے ہیں۔۱۹۶۷ء میں ناصر نے کہا: ''ہم اسرائیل کو اٹھا کر بحیرۂ قلزم میں غرق کر دیں گے۔'' اس بیان کے تین چار دن بعد اسرائیل نے حملہ کر کے پانچ دن کے اندر اندر بشمول مصر تین ملکوں کو یوں شکست دی کہ سویز سے قاہرہ تک مصر کا ایک سپاہی بھی موجود نہیں تھا۔خلیجی جنگ میں امریکی حملہ کے وقت صدام نے اسے ''ام المحارب'' یعنی جنگوں کی ماں قرار دیا۔ یہ جنگ تین دن میں عراق کی بدترین شکست پر اپنے انجام کو پہنچی۔

عالم اسلام کا ہر قائد اپنی ذات سے اوپر اٹھ کر کچھ سوچنے کے لیے تیار نہیں۔ ہر ایک اپنی حکومت برقرار رکھنے کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار رہتا ہے۔اسی لیے کسی بھی ملک کے اندر متبادل لیڈر شپ نہیں ابھرتی۔ ہر حکمران مسلسل غلطیاں کرتا رہتا ہے اور اس کا خمیازہ پوری قوم کو بھگتنا پڑتا ہے۔ یہاں جمہوریت ہے نہ ادارے۔نہ اجتماعی قربانی ہے نہ انفرادی، نفسانفسی کا دور دورہ ہے۔اسی لیے مسلمان مما لک نے پچھلے پچاس برسوں میں آپس میں نہایت خوف ناک جنگیں لڑی ہیں۔صرف یہی نہیں، بلکہ خود کئی ملکوں کے اندر خانہ جنگیوں میں بھی لاکھوں جانیں ضائع ہوئی ہیں۔مثلاً ایک لمبے عرصے تک انڈونیشیا اور ملائشیا کا آپس میں قضیہ چلتا رہا۔یمن خانہ جنگی کا شکار رہا۔سعودی عرب شمالی یمن کا طرف دار اور مصر جنوبی یمن کا حمایتی تھا۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

سعودی عرب کے فوجی شمالی یمن کی طرف سے اور مصر کے فوجی جنوبی یمن کی طرف سے لڑتے تھے۔ یہ لڑائی ایک لمبی مدت تک چلتی رہی جس میں دونوں طرف سے ہزاروں سپاہی ہلاک ہوئے۔ شام اور عراق میں خون ریز انقلاب آئے۔ شام میں ایک لمبے عرصے تک حکومت اور اخوان المسلمون کے درمیان مسلح جنگ ہوتی رہی۔ ایک دفعہ حکومت نے اخوان کے زیر قبضہ ایک شہر پر بم باری کر کے ایک تہائی شہر کو ملیا میٹ کر دیا۔ صرف اسی ایک حملے میں ہزاروں اموات ہوئیں۔ عراق میں صدام انتظامیہ نے اپنے سیاسی مخالفین اور کرد علیحدگی پسندوں کے خلاف قتل و غارت کا بازار گرم کیے رکھا۔ افریقہ میں الجزائر، تیونس اور مراکش کا مغربی صحارا کے مسئلے پر آپس میں مناقشہ زوروں پر تھا۔ الجزائر میں ۱۹۹۱ء کے بعد خانہ جنگی شروع ہوئی جس میں ایک محتاط اندازے کے مطابق ایک لاکھ افراد ہلاک ہو چکے ہیں۔

پاکستان کی اپنی غلطیوں سے بنگالی عوام میں احساس محرومی آخری درجے میں پیدا ہو گیا۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابی نتائج کو عملاً ماننے سے انکار اور مشرقی پاکستان میں فوجی ایکشن کے نتیجے میں خانہ جنگی برپا ہوئی۔ جس میں لاکھوں بنگالی بھی تہ تیغ ہوئے اور پاکستانی افواج کو بھی ایک بڑے نقصان کے علاوہ ذلت آمیز شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ انڈونیشیا میں فوج کے دو متحارب دھڑوں کے درمیان لڑائی ہوئی۔ ایک گروہ کمیونزم کا حامی، جب کہ دوسرا گروہ مغرب کا حامی تھا۔ اس لڑائی میں بھی بہت بڑا نقصان ہوا۔ اسی کے نتیجہ میں سوہارتو برسر اقتدار آئے اور اگلے پینتیس برسوں تک انڈونیشیا کے سیاہ و سفید کے مالک بنے رہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

افغانستان میں ظاہر شاہ کی پالیسیوں کی وجہ سے کمیونسٹوں کو بڑا اثر و نفوذ حاصل ہو گیا۔ پھر سردار داؤد نے بھی ابتدا میں اس کو بڑھایا اور پھر جب اسے ہوش آیا تو پانی سر سے گزر چکا تھا۔ ۱۹۷۷ء میں سردار داؤد کا تختہ بھی الٹ کر ایک اشترا کی انقلاب برپا کر دیا گیا۔ خانہ جنگی میں اتنی شدت پیدا ہوئی کہ دو برس بعد روس نے اپنی فوج بھیج کر براہ راست مداخلت کر دی۔ سات برس بعد روسی افواج واپس ہوئیں۔ لیکن ان کی واپسی کے مزید چار سال بعد تک کابل اور دوسرے اہم شہروں پر نجیب کی حامی افواج کا قبضہ رہا اور لڑائی جاری رہی۔ گویا روسیوں کی بھیانک غلطی اپنی جگہ پر، مگر اصل میں تو یہ افغان تھے جو آپس میں لڑتے رہے اور آج تک لڑتے چلے آ رہے ہیں۔

۸۰ء کی دہائی میں عراق نے ایران پر حملہ کر دیا۔ یہ لڑائی آٹھ برس جاری رہی اور اس میں دونوں طرف سے دس لاکھ افراد ہلاک ہوئے چھ لاکھ ایرانی اور چار لاکھ عراقی۔ نہ صرف پوری دنیا، بلکہ مسلمان ممالک کی تنظیم او آئی سی بھی تماشا دیکھتی رہی۔ جہاں ایک طرف ایران کی ساری آمدنی اسلحہ پر لگ گئی، وہاں مال دار عرب ممالک مسلسل عراق کی مدد کرتے رہے۔ آٹھ برس بعد یہ بے نتیجہ اور فضول جنگ اس وقت ختم ہوئی جب دونوں طاقتوں میں لڑنے کا دم خم رہا ہی نہیں۔

اس کے بعد عراق نے ایک سرحدی تنازع کو بہانہ بنا کر کویت پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد اقوام متحدہ کے جھنڈے تلے پوری دنیا عراق کے خلاف صف آرا ہو گئی۔ عراق سے بار بار اپیلیں کی گئیں۔ اقوام متحدہ کی قرار دادیں سخت سے سخت تر ہو

گئیں۔مگر صدام کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی ۔بالآخر امریکہ کی زیر قیادت ایک فوجی آپریشن کے ذریعے سے چند ہی دنوں میں عراق کو کویت سے نکال باہر کیا گیا۔اس تنازع میں لاکھوں اموات کے علاوہ تمام عرب ممالک کی معیشت کا بیڑا غرق ہو گیا۔اس حملے کے ضمن میں صدام کی حمایت میں بعض اوقات یہ دلیل دی جاتی ہے کہ خود امریکہ نے اسے یہ اجازت دی تھی اور یہ کہا جاتا ہے کہ حملے سے پہلے صدام نے امریکی سفیر کو بلا کر اس کے سامنے کویت کے خلاف اپنی شکایت رکھی تو امریکی سفیر نے اسے کہا کہ آپ دونوں کے سرحدی تنازعے میں امریکہ غیر جانب دار ہے۔فرض کیجیے یہ واقعہ صحیح ہو تو کیا اس سے واقعی یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ امریکہ نے عراق سے کہا کہ اسے کویت پر قبضہ کرنا چاہیے؟اور فرض کیجیے امریکہ نے اسے کھلے الفاظ میں کہا کہ اگر وہ کویت پر حملہ کرے گا تو امریکہ اسے کچھ نہیں کہے گا تو کیا امریکہ کے یہ کہنے پر صدام کو واقعی ایک برادر ہمسایہ مسلمان ملک پر حملہ کرنے کی بے وقوفی کرنی چاہیے تھی؟ کیا دوسرے کے بہکاوے میں آکر اپنے بھائی کی ملکیت پر قبضہ کرنا کوئی صحیح بات ہے؟اور پھر جب ساری دنیا بشمول امریکہ نے اسے کئی مہینوں تک بار بار کہا کہ وہ یہ قبضہ چھوڑ دے حتیٰ کہ فوجی ایکشن ناگزیر دکھائی دینے لگا تو پھر صدام نے بروقت یہ قبضہ چھوڑا کیوں نہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب فضول وضاحتیں ہیں جو محض اپنی بھیانک غلطیوں پر پردہ ڈالنے کے لیے پیش کی جاتی ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اس عبرت ناک کہانی کا ایک اور پہلو بھی قابل غور ہے۔وہ یہ کہ جب صدام نے کویت پر قبضہ کر لیا تو یہاں پاکستان کے عوام میں خوشی اور مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی ۔گلی گلی کوچے کوچے میں صدام کی حمایت میں جلسے ہونے لگے۔ مذہبی جماعتوں نے عراق کی حمایت میں پروگرام کیے حتیٰ کہ چیف آف آرمی اسٹاف جنرل اسلم بیگ بھی عراق کی حمایت میں مسلسل بیان بازی کرنے لگے۔عوام کی مسرت وشادمانی کا یہ عالم تھا کہ گویا عراق نے کویت پر نہیں، بلکہ اسرائیل پر قبضہ کر لیا ہو۔یہ ہے ہماری حکمت ودانش اور دوراندیشی کا حال۔

یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ پچھلے پچاس برس کے دوران میں مسلمانوں نے آپس کی خانہ جنگیوں میں ایک دوسرے کا جتنا خون بہایا ہے،اس کا عشر عشیر بھی غیر مسلم طاقتوں کے ساتھ لڑائی میں نہیں بہایا گیا۔ہمارا ہی ایک طبقہ بڑی آسانی سے یہ کہہ کر مطمئن ہو جاتا ہے کہ یہ سب کچھ غیروں کی سازشوں سے ہوا۔لیکن یہ محض حقائق سے آنکھیں چرانے والی بات ہے۔سوال یہ ہے کہ صرف ہم ہی کیوں دوسروں کی سازشوں کا آلۂ کار اور شکار بنتے ہیں؟ تلخ حقیقت تو یہ ہے کہ اصل خرابی دراصل ہم میں ہے اور اگر ہم میں خامی وکمزوری نہ ہو تو کوئی طاقت بھی ہمیں اپنا آلۂ کار نہیں بنا سکتی۔

ہمارے لیے صحیح راہ عمل

درج بالا تین اجتماعی کمزوریوں کو ذہن نشین کرنے کے بعد یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ہماری نجات کا راستہ دراصل ان چار نکات پر مشتمل ہے:

۱۔امن کا وقفہ حاصل کرنا ۲۔ جمہوری کلچر اپنانا ۳۔سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی کو اپنا مقصد اولین قرار دینا

۴۔ جذباتیت سے مکمل پرہیز

امن کا وقفہ حاصل کرنے سے مراد یہ ہے کہ اس وقت جہاں جہاں مسلم اور غیر مسلم ممالک کے درمیان مسلح تنازعات درپیش ہیں، ان کے بارے میں ہم یک طرفہ فیصلہ کرلیں کہ ہم اس کے حل میں اپنی طرف سے طاقت استعمال نہیں کریں گے، ہم مکالمے کے ذریعے سے سمجھوتے کی طرف پیش رفت کی کوشش کریں گے اور اگر سمجھوتا نہیں ہوتا تب بھی کسی بھی حالت میں مسلح کارروائی کی طرف قدم نہیں اٹھائیں گے۔ کسی بھی سمجھوتے کے لیے ہم ''منصفانہ'' کی شرط عائد نہیں کریں گے، بلکہ کچھ لو اور کچھ دو کی بنیاد پر عملی حل کی طرف بڑھیں گے۔

اس نکتے کی بنیاد یہ ہے کہ اس وقت ہم کمزور اور ہمارے مقابل کی قوتیں توانا اور مضبوط ہیں۔ قبل از وقت میدان جنگ میں کود پڑنا خود اپنے ہاتھوں ایک اور شکست کو تحریر کرنا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ درحقیقت مسلمانوں کو درپیش ہر مسئلے کا ایک ایسا ممکن عملی حل موجود ہے جس پر عمل پیرا ہونے سے معاملات سدھر سکتے ہیں۔ فی الوقت ہمارے سامنے چار مسائل ہیں۔ یعنی کشمیر، فلسطین، عراق اور افغانستان۔ کشمیر کے مسئلے پر ہم ایک اور تحریر میں بہت تفصیل کے ساتھ روشنی ڈال چکے ہیں۔ عراق کے مسئلے کے حل کی کنجی صدام حسین کے پاس ہے۔ اگر صدام آج اعلان کر دے کہ وہ اپنے ملک میں جمہوری پارٹیوں کو اجازت دے رہا ہے اور چھ مہینوں کے اندر اندر آزادانہ اور منصفانہ انتخابات کے ذریعے سے اقتدار جمہوری نمائندوں کو منتقل کر دیا جائے گا جس میں وہ خود امیدوار نہیں ہوگا تو امریکی حملے کا سارا اندیشہ اور مداخلت کا خطرہ ہوا ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر افغانستان کے اندر تمام مسلح گروہ اپنی یورش ختم کر دیں اور سیاسی پارٹیاں بنا کر حکومت سے جمہوری انتخاب کا مطالبہ کریں تو اس ملک کے اندر امریکی افواج کی موجودگی کا جواز ختم ہو جائے گا۔

فلسطین کا مسئلہ یقیناً پیچیدہ ہے۔ ہماری دانست میں صدر کلنٹن کی آخری پیش کردہ تجویز سب سے مناسب ممکن عملی حل تھا جس کے مطابق غزہ کی پوری پٹی اور مشرقی یروشلم و مسجد اقصیٰ سمیت مغربی کنارے کے سترفی صد حصے پر مشتمل فلسطینی ریاست وجود میں لانا مقصود تھا۔ یہ حل اسرائیل کی لیبر پارٹی کو منظور ہے۔ تاہم برسر اقتدار، انتہا پسند لیکوڈ پارٹی، جو انتفادہ ہی کے نتیجے میں مقبولیت کی معراج پر پہنچی، اسے مسترد کرتی ہے۔ اگر فلسطینی قیادت آج اس حل کو قبول کرنے کا اعلان کرے اور ہر طرح کی مسلح کارروائیاں روک دینے کا فیصلہ کرے تو کچھ ہی عرصے میں حالات میں مثبت تبدیلی آسکتی ہے۔ لیکن اگر موجودہ صورت حال جاری رہتی ہے تو شاید پھر فلسطینیوں کو یہ کچھ بھی نہ مل سکے۔

مسلمان ممالک کو ایک دفعہ امن کا وقفہ میسر آجائے تو وہ اگلے سو پچاس برس کے اندر اندر ترقی یافتہ ممالک کے ہم پلہ بن سکتے ہیں، اپنے معاشروں کی تعمیر کر سکتے ہیں اور خوش حالی کی نئی منزلوں کی طرف پیش قدمی کر سکتے ہیں۔ واضح رہے کہ یہ ایک ایسی حکمت عملی ہے جس پر دنیا کی ہر ہوش مند قوم عمل کرتی ہے۔ خود مغرب نے اپنے زریں دور میں اس پر عمل کیا ہے۔ مثلاً پرتگیزی نوآبادی ایسٹ تیمور نے جو عیسائی اکثریت پر مشتمل تھا، ۱۹۷۴ء میں آزادی کا اعلان کیا۔ بعد ازاں اس پر انڈونیشیا

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.org

نے قبضہ کرلیا۔اگرچہ اقوام متحدہ نے ایسٹ تیمور کی آزادی کے حق میں قرارداد بھی منظور کر لی، تاہم انڈونیشیا کی طاقت کے سبب اس کے خلاف کوئی عملی کارروائی نہیں کی گئی۔چھبیس برس بعد جب انڈونیشیا ایک بڑے داخلی بحران سے دوچار ہوا تو ایسٹ تیمور کی آزادی کا راستہ خودبخود نکل آیا اور مغرب نے اس کے لیے اقوام متحدہ کے تحت تمام انتظامات کیے۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ تمام مسلمان ممالک اپنے ہاں کامل جمہوری کلچر کو بطور اصول وقدر اختیار کرلیں۔جمہوریت کے بغیر عوام عملاً غلام رہتے ہیں۔جمہوریت ہی کے ذریعے سے صحت مند مسابقت کا ذہن فروغ پاتا ہے جس سے ترقی کا راستہ کھلتا ہے۔مختلف ممالک کے آپس میں ایک دوسرے کے نزدیک آنے کے لیے بھی جو قدر سب سے زیادہ ممد و معاون ثابت ہوتی ہے، وہ جمہوریت ہے۔اسی لیے تمام یورپی اقوام ایک دوسرے کے بے حد قریب آ گئی ہیں اور ان کے درمیان سرحدیں ماند پڑ گئیں ہیں۔مسلمان ممالک بھی صرف اسی وقت ایک دوسرے کے قریب آ سکتے ہیں اور ان کا تعاون عملی حقیقت میں بدل سکتا ہے جب ان سب کے ہاں جمہوری کلچر وجود میں آئے۔یوں تو ہمارے ہاں ہر مرض کا علاج یہ نعرہ سمجھا جاتا ہے کہ ''عالم اسلام کو متحد ہو جانا چاہیے۔''لیکن اس امر کی طرف بہت کم نگاہ جاتی ہے کہ اس کے لیے شرط اولین جمہوریت پر کاربند ہونا ہے۔ آج کے حالات میں اس شرط کے پورا کیے بغیر ایک حد سے زیادہ تعاون پر کاربند ہونا ممکن نہیں ہے۔

تیسرا نکتہ یہ ہے کہ تمام مسلمان ممالک سائنس اور ٹیکنالوجی کے حصول کو اپنا مقصد اولین قرار دیں۔اس کے بغیر دنیا میں عزت ووقار سے جینے کا خواب دیکھنا فضول ہے۔آج کے حالات میں وہی کامیاب ہے جس کی دسترس میں ٹیکنالوجی ہے۔یہی طاقت وقوت ہے اور یہی دولت ہے۔اس کے سامنے باقی تمام سرمایہ ہیچ ہے (عالم اسلام کے تمام ممالک بشمول تیل پیدا کرنے والے ممالک کی مجموعی آمدنی ایک اسپین کی آمدنی سے کم ہے)۔لیکن آج ٹیکنالوجی کا حصول جتنا آسان ہے، اتنا کبھی نہ تھا۔ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کی ایجاد نے ٹیکنالوجی کے حصول میں موجود اکثر رکاوٹیں قابل عبور بنا دی ہیں۔تاہم یہ کوئی قلیل المیعاد فیصلہ نہیں ہے۔جب تمام ملکی توانائیوں کا رخ اس طرف پھیر دیا جائے تب کہیں جا کر چند دہائیوں میں ترقی یافتہ ممالک کے ہم پلہ آنے کا سوچا جا سکتا ہے۔

چوتھا نکتہ جذباتیت سے مکمل پرہیز ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ جذباتی نعرے نہ لگائے جائیں، جذباتی تقریریں نہ کی جائیں، مغرب کو نہ للکارا جائے، دھمکیاں نہ دی جائیں، بغیر سوچے سمجھے اقدامات نہ اٹھائے جائیں، حکمت ومصلحت کی پالیسی اختیار کی جائے۔ہر مثبت بات کی جائے اور منفی بات سے پرہیز کیا جائے۔دراصل جذباتی اور بلند بانگ نعرے اور دعوے ایک انتہا پسندانہ ردعمل کی ذہنیت کو جنم دیتے ہیں۔جس میں انسان بے سوچے سمجھے مرنے مارنے پر اتر آتا ہے۔اسی عالم میں کیے گئے تمام انفرادی اور جذباتی فیصلے نیم پختہ اور غلط ہوتے ہیں۔جس کا نتیجہ خود ہمارے ہی لیے زہر قاتل ہوتا ہے۔پچھلے تین سو برس سے ہم سے ایسے ہی غلط فیصلے سرزد ہو رہے ہیں۔اس سے دوسری قوتیں بھی تشویش اور پریشانی کا شکار ہو جاتی ہیں اور ہم بزور ان کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔اقبال نے کیا خوب کہا تھا:

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

کہہ رہا ہے جوش دریا سے سمندر کا سکوت

جس کا جتنا ظرف ہے، اتنا ہی وہ خاموش ہے

پس چہ باید کرد

یہ بڑی عجیب بات ہے کہ اگر امریکہ ہم سے تعلقات کار رکھنا چاہتا ہے تب بھی اور اگر وہ ہمارا دشمن ہے تب بھی، دونوں صورتوں میں ہماری حکمت عملی کے بنیادی نکات ایک ہی جیسے بنتے ہیں۔ یعنی امن کا وقفہ حاصل کرنا، جمہوریت، ٹیکنالوجی میں پیش رفت اور جذباتیت سے اجتناب۔

دراصل قومی وقار، ترقی، خود انحصاری، اور حقیقی خودمختاری کے لیے یہی واحد لائحۂ عمل ہے۔ ہم توانا و طاقت ور ہوں گے تو دوسری قوتیں ہم سے تعلقات کار بھی بہتر انداز سے رکھیں گی اور ہماری طرف میلی آنکھ سے دیکھ بھی نہ سکیں گی۔ جب ہم یہ سب کچھ حاصل کر لیں گے تو دنیا میں تعلقات کار کی ایک نئی مساوات بنے گی جس میں ہم بھی برابر کے حصہ دار ہوں گے۔

تاہم یہاں ایک سوال پیش آتا ہے جس پر بحث ضروری ہے۔ کیا مغرب ہمیں اپنے مقاصد کی طرف پیش قدمی کرنے دے گا، کیا وہ ہمیں امن حاصل کرنے دے گا، کیا وہ ہمیں یہ موقع دے گا کہ ہم ترقی کر سکیں؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ کوئی دوسرا ہمیں موقع نہیں دے گا، بلکہ ہم خود اپنے لیے موقع حاصل کریں گے۔ دنیا کے اندر ہمیشہ ہر کسی لیے مواقع کے بے شمار امکانات ہوتے ہیں، یہ اس گروہ کی عقل و دانش پر منحصر ہے کہ وہ حکمت سے کام لے کر ان مواقع سے فائدہ اٹھاتا ہے، یا انھیں گنوا دیتا ہے۔ اس وقت ہمارے جتنے مسائل ہیں، ان کے حل کرنے میں صرف ہمارا ہی نہیں، بلکہ دوسرے فریق کا بھی فائدہ ہے۔ کشمیر ہی کو لے لیجیے۔ اس کے حل ہونے سے صرف ہم ہی نہیں، بلکہ بھارت کی بھی کئی مسائل سے جان چھوٹ جائے گی۔ یہی صورت باقی تمام مسائل کی ہے۔ مواقع حاصل کرنے کے ضمن میں چین کی مثال بہت موزوں ہے۔ چین نے یہ سوچی سمجھی پالیسی بنائی ہے کہ وہ اپنے اقتصادی مسائل حل ہونے اور ٹیکنالوجی پر پوری گرفت حاصل ہونے تک کسی بین الاقوامی قضیے میں اپنے آپ کو ملوث نہیں کرے گا۔ چنانچہ اسی پالیسی کے تحت اس نے ہر اشتعال انگیزی کا نہایت صبر و تحمل کے ساتھ مقابلہ کیا ہے۔ اس نے پاک بھارت تنازع سے اپنے آپ کو الگ رکھا، اس نے افغان مسئلے میں کوئی بڑا کردار ادا نہیں کیا، اس نے تائیوان کے مسئلے پر ہمیشہ تحمل کی پالیسی اختیار کی حتیٰ کہ جب اس نے اپنی فضائی حدود میں امریکہ کا جاسوس طیارہ مار گرایا جو یقیناً ایک سنگین واقعہ تھا تو اس نے پورے طور پر معاملے کو رفع دفع کر دیا اور امریکہ کو جہاز کا ملبہ بھی لے جانے کی اجازت دے دی۔

چنانچہ اگر ہم بھی اپنے لیے امن کا وقفہ حاصل کرنا چاہیں گے تو دوسری طاقتیں ہمیں بڑا اشتعال دلائیں گی، ہمیں طرح

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

طرح کے مسائل میں الجھانے کی کوشش کریں گی، ہمارے راستے میں بہت سی رکاوٹیں ڈالنے کی کوشش کریں گی، تاہم ہمیں حکمت و دانش اور صبر و تحمل کے ساتھ اپنے مقصد پر نگاہ رکھتے ہوئے آگے بڑھنا ہو گا۔

یہاں ایک اور اہم بات بھی مدنظر رکھنی ضروری ہے، وہ یہ کہ امریکہ کے لیے کسی ایسے ملک یا ملکوں سے لڑائی مول لینا، جہاں جمہوریت بھی ہو، انسانی حقوق کی پاس داری بھی ہو رہی ہو اور وہ پر امن بقاے باہمی کے اصول پر بھی گام زن ہوں، ناممکن حد تک مشکل ہے۔ وہاں کی رائے عامہ، دوسرے مغربی ممالک اور دنیا کی پیچیدہ سیاست کاری اس کو ناکام بنا دے گی۔ مغربی رائے عامہ اب اس حد تک بیدار ہو چکی ہے کہ امن اور جمہوریت کے اصولوں کو ساتھ لے کر ان سے مکالمہ کرنا اور انھیں اپنا ہم نوا بنانا ممکن ہے۔ ہمیں اس موقع کو اسلام کی دعوت پھیلانے اور مسلمانوں کے بچاؤ اور استحکام کے لیے استعمال کرنا چاہیے۔

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ریحان احمد یوسفی

عروج وزوال کا قانون ـــــ تاریخ کی روشنی میں

(۳)

عروج وزوال کے عوامل

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

پچھلے مباحث میں ہم نے اس بات کا جائزہ لیا ہے کہ ایک قوم اپنی زندگی میں عروج وزوال کے کن کن مرحلوں سے گزرتی ہے،قوم کے اجزاے ترکیبی کیا ہوتے ہیں اور عروج وزوال کے عمل میں ان کا کردار کیا ہوتا ہے۔ نیز یہ کہ اس قانون عروج وزوال کو جاننے کی اہمیت وافادیت کیا ہے۔تاہم خود عروج وزوال کے پیچھے کام کرنے والے اسباب وعوامل کیا ہوتے ہیں، اس کا جائزہ ہمیں ابھی لینا ہے۔اس بحث میں یہی ہمارا موضوع رہے گا۔

اس مختصر تحریر میں دنیا کی تمام اقوام اور تہذیبوں کا ایک ایک کر کے جائزہ لینا اوران کے عروج وزوال کے محرکات پر تفصیلی تبصرہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ہم صرف ان بنیادی اصولوں پر بحث کریں گے جو ہمارے نزدیک عروج وزوال کے ضمن میں فیصلہ کن کردار ادا کرتے ہیں۔ان میں سے دو غیر اختیاری ہیں اور دو ایسے ہیں جن کا ترک واختیار اقوام کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ان کی تفصیل درج ذیل ہے۔

غیر اختیاری عوامل

قوموں کے عروج وزوال میں دو عناصر ایسے ہیں جن کا تعلق قوموں کی مرضی واختیار سے نہیں، بلکہ اس معاملے میں وہ کائنات کے چلانے والے کی مرضی واختیار کے پابند ہیں۔ان میں سے پہلی چیز قوم کی اندرونی توانائی ہے، جبکہ دوسری چیز

خارج میں پیش آنے والے خطرات اور چیلنج ہیں۔ ذیل میں ہم ان کی کچھ وضاحت کریں گے۔

ا۔قوم کی اندرونی توانائی

اقوام عالم کے عروج وزوال میں سب سے بنیادی امر یہ ہے کہ معاشرے کے وہ اجزاے ترکیبی، جن کا تفصیلی ذکر پچھلے مباحث میں ہم کر چکے ہیں، کس حدتک اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ جب تک قوم کے یہ اجزاے ترکیبی اپنا کردار درست طور پر ادا کرتے ہیں، قوم عروج وترقی کی طرف گامزن رہتی ہے اور جب معاملہ برعکس ہو تو قوم بھی زوال کا شکار ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک حیوانی جسم میں اگر تمام نظام ہاے زندگی ٹھیک طور پر اپنا کردار ادا کرتے ہیں تو وہ جسم فعال رہتا ہے، مگر جب ان پر اضمحلال طاری ہوتا ہے اور وہ اپنے معمولات کو درست طور پر ادا نہیں کر پاتے تو جسم کمزور ہونا شروع ہو جاتا ہے اور آخر کار زندگی کی حرارت سے محروم ہو کر وادی عدم میں اتر جاتا ہے۔ اسی طرح انسانی معاشرہ اپنے عروج وزوال کے عمل میں اپنے اجزاے ترکیبی کی قوت وضعف سے براہ راست متعلق ہوتا ہے۔ جب تک ان میں قوت رہتی ہے اور وہ اپنے فرائض وذمہ داریاں احسن طریقے سے پورا کرتے رہتے ہیں تو معاشرہ مستحکم اور قوم ترقی کی طرف گامزن رہتا ہے اور جب وہ کمزور ہوتے ہیں اور اپنے فرائض سے غفلت برتنے لگتے ہیں تو قوم زوال پزیر ہو جاتی ہے۔

مثال کے طور پر فکری قیادت کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ حالات کا گہرا تجزیہ کرے اور بدلتی ہوئی دنیا میں قوم کے سامنے ایک ایسا لائحۂ عمل رکھے جو قوم کی امنگوں اور اس کے حوصلوں کو درست سمت عطا کرے۔ مذہبی قیادت کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ ایک طرف اخلاقی اقدار کو قومی کردار میں زندہ رکھے تو دوسری طرف معاشرتی ارتقا اور مذہبی اصولوں میں قائم توازن کو برقرار رکھے۔ اسی طرح سیاسی قیادت کا کام ہے کہ حوصلہ مندی اور بصیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہر طرح کے حالات میں ایسی حکمت عملی اختیار کرے جس سے قوم اندرونی اور بیرونی خطرات سے محفوظ رہے۔ یہ اور ان جیسے دیگر بہت سے وظائف ہیں جو قوم کی قیادت کی بنیادی ذمہ داریاں ہیں۔ تاہم ان کی درست ادائیگی صرف اس وقت ممکن ہے جب قیادت زندگی سے بھرپور ہو۔ زندگی کی توانائیوں سے محروم قیادت عام حالات میں بھی قوم کو زوال پزیر کر دیتی ہے اور کسی خطرہ کے پیش آنے پر تو بالکل بے جان ثابت ہوتی ہے۔

جہاں تک اس بات کا سوال ہے کہ قوم کے اجزاے ترکیبی کیوں قوت وضعف کا شکار ہوتے ہیں تو اس کے دو بنیادی اسباب ہیں۔ ان میں سے ایک کی تفصیل ہم اختیاری عوامل کے تحت آگے بیان کر رہے ہیں۔ تاہم اس کا دوسرا سبب فطرت کا قانون اجل ہے، جس کے تحت خدا کسی کو لامحدود زندگی نہیں دیتا، بلکہ ایک خاص وقت کے بعد زندگی کو موت سے بدل دیتا ہے۔ اس عمل میں زندگی دینے والے عناصر بتدریج کم سے کم تر اور کمزور سے کمزور تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اور ایک خاص وقت پر پہنچ کر زندگی کا بوجھ اٹھانا ان کی استطاعت سے باہر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ زندگی موت کی آغوش میں پناہ لینے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ اگر ہم سائنس کی تعبیر مستعار لیں تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر شے کو ایک خاص مقدار میں مخفی توانائی

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

دے کر اس دنیا میں بھیجتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ مخفی توانائی حرکی توانائی (Kinetic Energy) (Potential Energy) میں تبدیل ہو کر زندگی کی کہانی لکھتی رہتی ہے۔ ایک وقت آتا ہے کہ وجود اپنی مخفی توانائی کا تمام تر خزانہ صفحۂ ہستی کو بامعنی بنانے میں صرف کر دیتا ہے، جس کے بعد زندگی کی حرکت موت کے سکوت میں بدل جاتی ہے۔

ایک زیادہ قابل فہم مثال حیوانی اجسام کی ہے جن میں خلیات (Cells) زندگی کی توانائی کا مرکز ہوتے ہیں۔ زندگی کے آغاز پر ان کی پیدایش کا عمل بہت تیز ہوتا ہے۔ چنانچہ زندگی کی گاڑی تیزی سے آگے کی سمت اپنا سفر طے کرتی ہوئی بام عروج پر پہنچ جاتی ہے۔ اس دوران میں زندگی کی بنیادی اکائی یعنی خلیات کی پیدایش کا عمل کم سے کم ہوتا چلا جاتا ہے۔ ایک وقت آتا ہے کہ پیدایش کا یہ عمل اتنا کم ہو جاتا ہے کہ جسم اپنے عام فرائض کو ادا کرنے میں دقت محسوس کرنے لگتا ہے۔ ایسے میں کوئی معمولی سی بیماری بھی لاحق ہو جائے تو بڑھتے بڑھتے جان لیوا ثابت ہوتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح انسانی معاشروں میں ایک خاص وقت گزرنے کے بعد زندہ افراد پیدا ہونا کم ہو جاتے ہیں۔ ان کی کمی کی بنا پر معاشرہ کمزور ہونا شروع ہو جاتا ہے اور ایک وقت آتا ہے کہ معاشرہ مردہ نفوس کا ایک ہجوم بن جاتا ہے جسے فطرت کا قانون اجل ایک وقت آنے پر دھرتی سے مٹا دیتا ہے۔

مختصر یہ کہ اس دنیا میں کوئی قوم اصلاً اپنی اندرونی توانائی کی بنیاد پر قوت و استحکام حاصل کرتی ہے۔ جب تک معاشرے میں یہ توانائی موجود ہے، وہ اندر اور باہر سے پیش آنے والے خطرات کا جواب دیتا رہتا ہے۔ اس کے مختلف طبقات ان ذمہ داریوں کو بطریقۂ احسن ادا کرتے ہیں جو ان پر عائد ہوتی ہیں۔ جب یہ توانائی ختم ہونا شروع ہو جاتی ہے تو اس صورت میں قوم پہلے کمزور اور آخر میں زوال پزیر ہو جاتی ہے۔ توانائی میں کمی کے اس عمل کو روکنا کسی کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ قدرت کا یہ قانون جب حرکت میں آتا ہے تو بڑی سے بڑی سپر پاور بھی ماضی کا ایک افسانہ بن کر رہ جاتی ہے۔ ہم پچھلے صفحات میں قوموں کے عروج و زوال کے مراحل کے ضمن میں وہ پورا لائف سائیکل بیان کر چکے ہیں جس سے ایک سپر پاور گزرتی ہے۔ مصری، رومی، عرب، ترک سب اپنے عروج کے دور میں دنیا بھر کے حاکم تھے، مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی توانائی میں کمی آتی چلی گئی، جس کے نتیجے میں ان کی قیادت ختم ہو گئی سلطنت برباد ہو گئی اور بحیثیت قوم انھیں دوسری اقوام کی مغلوبیت یا اپنے ابتدائی جغرافیہ میں سمٹنے جیسے نتائج کا سامنا کرنا پڑا۔

۲۔ خارجی چیلنج

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی دنیا مقابلے کے اصول پر بنائی ہے۔ اس دنیا میں کسی وجود کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ خارجی دنیا میں پیش آنے والے خطرات سے بے پروا ہو کر زندگی گزارے۔ جب تک کسی قوم کی اندرونی توانائی اس کا ساتھ دیتی ہے، وہ خارج کے ان چیلنجوں کا مقابلہ کرتی ہے، مگر جب یہ توانائی کم یا ختم ہو جاتی ہے تو وہ ان خطرات کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتی ہے۔ تاہم بعض اوقات چیلنجوں اور خطرات اس قدر بڑے اور عظیم ہوتے ہیں کہ وہ قومیں بھی جن

کی اٹھان دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ ابھی بڑھاپے سے کوسوں دور ہیں، ان کے مقابلے میں خود کو بے دست و پا محسوس کرتی ہیں۔ جس طرح کوئی جوان رعنا کسی تیز رفتار گاڑی کے سامنے آ کر موت کا نوالہ بن جاتا ہے، اسی طرح بعض اوقات ایک قوم بھی کسی ایسے حادثے کا شکار ہو جاتی ہے جو اس کی ہمت و استعداد سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ یہ چیلنج یا حادثہ قدرت کی طرف سے بھی ہو سکتا ہے۔ مثلاً زراعتی دور میں جو معلوم تاریخ کا سب سے بڑا دور ہے، بارہا ایسا ہوا کہ خشک سالی قوموں کی تباہی کا سبب بن گئی۔ یا وہ قومیں جو دریاؤں کے کنارے آباد تھیں، سیلاب آنے یا دریا کا رخ تبدیل ہو جانے کی بنا پر اپنا وجود برقرار نہ رکھ سکیں۔ وادی سندھ کی تہذیب جو دنیا کی قدیم ترین تہذیب شمار ہوتی ہے، اس کی تباہی کے جو اسباب محققین بیان کرتے ہیں، ان میں سے ایک نمایاں سبب ایسے ہی قدرتی عوامل کی کارفرمائی تھا۔ اسی طرح قرآن مجید کی سورۂ سبا (۳۴) کی آیات ۱۵ تا ۱۹ میں قوم سبا کا جو قصہ بیان کیا گیا ہے، اس میں سبا کی تباہی کا نقطۂ آغاز عالم اسباب میں وہ عظیم سیلاب تھا جسے ''سیل العرم'' کہا جاتا ہے۔

چیلنج کی دوسری قسم جو کسی قوم کو اس وقت تباہ کر دیتی ہے جب کہ اس کی قدرتی زندگی کا خاتمہ ابھی دور ہوتا ہے، اکثر و بیشتر دوسری اقوام کی طرف سے یلغار کی صورت میں پیش آتی ہے۔ مغربی رومی سلطنت کو روس اور شمالی یورپ کے وحشی قبائل کی جن یلغاروں کا سامنا کرنا پڑا، اس نے اس کے وجود کو بے حد نحیف کر ڈالا۔ تیمور لنگ نے جس وقت بایزید یلدرم کو شکست دی تو وہ ایک ابھرتی ہوئی طاقت تھا اور مشرقی یورپ میں مسلم اقتدار کی وسعت کے بعد پورے یورپ کی فتح کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ عثمانی حکومت کی خوش قسمتی تھی کہ یلدرم کے جانشین بہت باصلاحیت تھے، وگرنہ عثمانی ترکوں کی تاریخ یلدرم کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی۔

چیلنج کی ایک صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ کوئی قوم جانے انجانے میں کسی ایسی جنگ میں ملوث ہو جائے جس میں جیت کر بھی وہ اپنا وجود ہار جاتی ہے۔ دور جدید میں آخری دو سپر پاورز اسی جنگ و جدل کی وجہ سے قبل از وقت اپنا عروج کھونے پر مجبور ہو گئیں۔ برطانیہ عظمیٰ کی سلطنت جس میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا، دو عظیم جنگوں کی بنا پر اپنی عظمت و قوت گنوا بیٹھی اور واپس اس چھوٹے سے جزیرہ میں محدود ہو گئی جہاں سورج اکثر بادلوں کے پیچھے چھپا رہتا ہے۔ حال ہی میں سوویت یونین کی عظیم سپر پاور جو دنیا بھر میں خوف و دہشت کی علامت تھی اور جس کے بارے میں یہ کہا جاتا تھا کہ روس کے قدم جس ملک میں پڑ گئے، وہ باہر نہیں نکلتے، افغانستان میں ایک ایسی جنگ کا شکار ہوئی جس کے نتیجے میں نہ صرف اسے افغانستان خالی کرنا پڑا، بلکہ خود اپنے وجود کی بقا و حفاظت میں بھی ناکام ہو کر تحلیل ہو گئی۔

یہاں یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ چیلنج ہمیشہ قوم کو تباہ کر دیتے ہیں۔ یہ قوم کے عروج کا بھی سبب بنتے ہیں۔ یہ چیلنج ہی ہوتے ہیں جس سے کسی قوم پر اس کی وہ توانائیاں عیاں ہوتی ہیں جو اس قوم میں پوشیدہ ہوتی ہیں اور جن کا اظہار اس سے قبل نہیں ہوا ہوتا۔ چنگیز خان کو دنیا ایک عظیم فاتح کی حیثیت سے جانتی ہے۔ اس کی فتوحات کا آغاز وہ چیلنج تھا جو خوارزم شاہ نے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اس کے سفیروں کو قتل کر کے اس کے لیے پیدا کر دیا تھا۔ خوارزم شاہ خطے کا سب سے طاقت ور حکمران تھا جس کے بڑھتے ہوئے اقتدار کا اگلا نشانہ بغداد کی خلافت تھی۔ اس سے ٹکرانے کا فیصلہ آسان نہ تھا۔ اس کا نتیجہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ تاتاریوں کو بڑی تباہی اٹھا کر بھی کچھ نہ ملتا، مگر چنگیز خان نے اس چیلنج کو قبول کیا اور نتیجے سے دنیا واقف ہے۔

اختیاری عوامل

درج بالا عوامل وہ تھے جو قوموں کے عروج و زوال میں بڑا اہم کردار ادا کرتے ہیں، مگر اصلاً یہ کسی قوم کے دائرۂ اختیار میں نہیں ہوتا کہ وہ ان دونوں محرکات کو اپنی طرف سے متعین کرے۔ وقت بہرحال گزرے گا اور اس کے بعد ضعف لازمی ہے۔ اسی طرح قدرتی حوادث بھی پیش آتے رہتے ہیں جن پر کسی قوم کا اختیار نہیں ہوتا۔ دوسری اقوام کے حملے اور جنگیں بھی کوئی ایسی چیز نہیں کہ کوئی قوم تنہا ان کے انجام کو متعین کر لے۔ تاہم اس دنیا میں خدا نے دو معاملات ایسے رکھے ہیں جن میں قوموں کے پاس موقع ہوتا ہے کہ نہ صرف وہ اپنی طبعی عمر میں اضافہ کریں اور اپنی توانائی کو زیادہ دیر تک برقرار رکھیں، بلکہ وہ ہر طرح کے خارجی چیلنج کا بھی مقابلہ کر سکتی ہیں۔ ان میں سے ایک چیز اخلاقی اقدار کی پاس داری ہے اور دوسری وقت کی مروجہ ٹیکنالوجی میں زیادہ سے زیادہ ترقی ہے۔ یہ دونوں چیزیں لوگوں کے اپنے اختیار کی ہیں اور جب وہ ان کی رعایت کرتے ہیں تو وہ غیر اختیاری محرکات کو بھی بالواسطہ اپنے اختیار میں کر لیتے ہیں۔

ا۔ اخلاقی اقدار کی پابندی

قوموں کی زندگی میں اخلاقیات کی کیا اہمیت ہے، اس بات کو سمجھنے کے لیے انسان کا تجزیہ کرنا ضروری ہے۔ انسان کو اس دنیا میں ایک حیوانی قالب دے کر بھیجا گیا ہے۔ بھوک، پیاس، شہوت اور کسی پناہ گاہ کا حصول اسی حیوانی قالب کی ضروریات ہیں۔ ان کے لیے جدوجہد کرتے ہوئے آنے والے خطرات سے مقابلے اور انھیں ختم کرنے کے لیے جنگ و جدل کرنا اس کے حیوانی وجود کی بقا کا ناگزیر تقاضا ہے۔ ان معاملات میں انسان جانور جیسا ہے۔ تاہم انسان کو قدرت کی طرف سے ایک فطرت صالحہ بھی عطا کی گئی ہے جو تمام اعلیٰ اخلاقیات کی ماخذ ہے۔ یہ فطرت انسانیت کی اساس ہے جس کی بنا پر انسان ہمیشہ خود کو کچھ ایسی حدود کا پابند محسوس کرتا ہے جن کی بنا پر وہ اپنے آپ کو جانوروں سے مختلف پاتا ہے۔ ممکن ہے کہ کوئی فرد اپنے حیوانی تقاضوں کے سامنے مغلوب ہو کر اخلاقی اصولوں کی خلاف ورزی کر بیٹھے، مگر انسان کے اجتماعی وجود میں ان کا تصور اتنا گہرا ہے کہ ایسا کوئی عمل، عام حالات میں انسانوں کے لیے کبھی نمونہ نہیں بن سکتا۔

حیوانی قالب اور فطرت صالحہ کے ساتھ ایک تیسری چیز جسے لے کر انسان اس دنیا میں آتا ہے، وہ عقل و بصیرت کی صلاحیت ہے۔ یہ صلاحیت انسان کی کمزوریوں کے باجود اسے طاقت ور بناتی ہے۔ انسان محض اپنے حیوانی وجود کی توانائیوں کے سہارے قدرت کی طاقتوں، دیگر انواع یا خود اپنے جیسے انسانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ یہ کام عقل و فہم کی ان صلاحیتوں کا

ہے جو خداوند نے دنیا میں بھیجتے وقت زادراہ کے طور پر اس کے ہم رکاب کی ہیں۔ اسی عقل کے سہارے انسان اس دنیا میں اپنی بقا کی جنگ لڑتا ہے اور ایک کمزور حیوانی وجود رکھنے کے باوجود ان تمام مخالفین کو شکست دے دیتا ہے جو اس سے کہیں زیادہ طاقت ور ہوتے ہیں۔

عقل وفہم کی یہ صلاحیتیں جو خارجی دنیا میں اس کی معاون ہوتی ہیں، اس کے داخل میں بھی حیوانی اور اخلاقی تقاضوں میں ایک توازن قائم رکھتی ہیں۔ انسان کے حیوانی جذبے بہت سرکش اور شدید ہوتے ہیں اور ہر رکاوٹ کو پھلانگ کر اپنی فوری تسکین کا مطالبہ کرتے ہیں۔ یہ عقل وبصیرت ہے جو نہ صرف انسان کے حیوانی جذبوں کو لگام ڈالتی ہے، بلکہ فطرت کی نسبتاً کمزور اور دبی ہوئی آواز پر لبیک کہتی ہے۔ تاہم جب انسان کے حیوانی تقاضے اس پر غالب آنے لگتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اب معاملات کی باگ ڈور عقل کے ہاتھوں سے نکل کر حیوانیت کے ہاتھوں میں جارہی ہے۔ اب اس کے وجود میں حکمران عقل نہیں، بلکہ حیوانی جذبات ہیں اور عقل ان کی خادم ہے۔ ظاہر سی بات ہے کہ حیوانیت کی اقلیم میں اخلاقیات کی دنیا کے فرمان جاری نہیں ہوا کرتے۔ حیوانیت اپنی اخلاقیات خود تشکیل دیتی ہے جس کی اساس عیش کوشی اور مفاد پرستی پر رکھی جاتی ہے۔

عقل جب فطرت و اخلاق کو حیوانیت پر غالب کرنے میں ناکام رہتی ہے تو عین اس وقت وہ خارج میں انسان کی حفاظت کے معاملے میں بھی غیر موثر ہونے لگتی ہے۔ اول تو جذبات کی ناز برداریاں خارج کے خطرات کی طرف اسے متوجہ ہی نہیں ہونے دیتیں اور اگر کبھی ایسا ہو بھی تو عقل فطرت کے ان صالح عناصر کی مدد سے محروم ہوتی ہے جو اکثر اخلاقیات کی شکست کے ساتھ ہی موت کے گھاٹ اتر جاتے ہیں۔ مثلاً شجاعت اور استقامت وغیرہ۔ جیسے ہی یہ معاملہ ہوتا ہے تو انسان اصلاً ایک کمزور جسم والے حیوان کے مقام پر آکر کھڑا ہو جاتا ہے۔ ایسا فرد زندگی کی جدوجہد میں زیادہ دیر تک شریک نہیں رہ پاتا۔

جب یہ رویہ پوری قوم یا اس کی اکثریت اختیار کر لیتی ہے تو ایسا معاشرہ اس قابل نہیں رہتا کہ خارج کے ان خطرات کا مقابلہ کر سکے جن کا پیش آنا اس دنیا میں ناگزیر ہے۔ نتیجہ صاف ظاہر ہے۔ ایسی قوم کے سامنے جیسے ہی کوئی چیلنج آتا ہے، وہ ریت کی دیوار کی طرح اس کے سامنے ڈھیر ہو جاتی ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ساز وآواز پر رقص کرنے والے موت کے رقص کے وقت بہت کمزور ثابت ہوتے ہیں۔ نازک کلائیاں اور شراب کے جام تھامنے والے ہاتھ تلوار کا بوجھ نہیں اٹھا پاتے۔ پسے ہوئے طبقات پر ظلم کرنے والے خارجی طاقتوں کے لیے تر نوالہ بنا کرتے ہیں۔ اس کے برعکس اخلاقی طور پر طاقت ور قوم کی عقلی صلاحیتیں کہیں زیادہ متحرک اور فعال ہوتی ہیں۔ اس کے افراد اپنے داخل میں ہم آہنگی پیدا کرتے کرتے خارجی ہم آہنگی کے فن میں بھی طاق ہو جاتے ہیں۔ ہر خطرے کے وقت ان کے دل اور دماغ یک سو ہو کر مقابلے پر آتے ہیں۔

عقل واخلاقیات کے اس باہمی تعلق کے علاوہ اخلاقیات کی ایک دوسری حیثیت یہ ہے کہ اصلاً یہ اس توانائی کا منبع ہے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

جس کا ذکر ہم شروع میں کر آئے ہیں۔ جس طرح ایک ورزش کرنے والا شخص تندرست وتوانا رہتا ہے، اسی طرح اخلاقی زندگی گزارنے والے لوگوں میں وہ خصوصیات ہمیشہ زندہ رہتی ہیں جو خطرات کے پیش آنے پر ان سے مقابلہ کے لیے ضروری ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اخلاقی زندگی اصل میں قربانی کی زندگی ہوتی ہے۔ جو گروہ روزمرہ کی زندگی میں اخلاقی اصولوں کے لیے قربانی نہیں دے سکتا، اس کے افراد اجتماعی ضرورت کے مواقع پر بھی اس درجہ کی قربانی پیش نہیں کر سکتے جو خطرات کو دفع کرنے کے لیے ضروری ہوتی ہے، بلکہ اخلاق سے محرومی کے بعد ان میں وہ خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں جو انھیں دوسروں کے لیے ایک آسان ہدف بنا دیتی ہیں۔ مزید براں یہ اخلاقی داعیات ہیں جو ذاتی مفادات سے بلند ہو کر قومی خدمت کے لیے اٹھنے والے بلند کردار لوگ پیدا کرتے ہیں۔ قومیں ایسے ہی لوگوں سے زندگی، طاقت اور توانائی کا خزانہ حاصل کرتی ہیں۔ جب یہ لوگ کم رہ جاتے ہیں، بالخصوص طبقۂ اشرافیہ میں، تو قوم انتہائی تیزی سے زوال کی طرف گامزن ہو جاتی ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اخلاقی خوبیوں کا فروغ ہی وہ چیز ہے جو معاشرے کے مختلف طبقات میں باہمی الفت ومحبت پیدا کرتا ہے۔ اور ان کی توانائیاں اندرونی کشمکش میں ضائع ہونے کے بجائے قومی تعمیر کے کام میں خرچ ہوتی ہیں۔ صورت حال اگر برعکس ہو تو باہمی آویزش قومی اتحاد کو پارہ پارہ کر دیتی ہے جو آخر کار تباہی وبربادی کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔

فلسفۂ تاریخ کا بانی ابن خلدون اخلاقیات کی اسی اہمیت کی بنا پر اسے غیر معمولی اہمیت دیتا ہے۔ وہ غلبہ واقتدار والی قوموں کی زندگی میں اخلاق حمیدہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''عادات پسندیدہ واخلاق حمیدہ اس قوم کے تمام افراد میں موجود ہیں۔ کرم وعفوان کا شیوہ ہے۔ مظلوم وبیکسوں کی باتوں کی برداشت اور آئے گئے مہمانوں کی میزبانی کرتے ہیں۔ محنت ومشقت اور جدوجہد سے جی نہیں چراتے۔ مکروہات پر صبر کرتے اور ایفائے عہد کو واجب جانتے ہیں۔ عزت کی حفاظت میں مال خرچ کرنے سے انھیں دریغ نہیں ہوتا... جو کوئی حق بات کہے اسے بغیر رعونت سنتے اور اس کی پیروی کرتے ہیں۔ ضعیف الحال لوگوں سے باانصاف وشفقت پیش آتے ہیں۔ بذل وسخا سے کام لیتے ہیں۔ مسکینوں سے بتواضع ملتے اور دادخواہوں کی فریاد سنتے ہیں۔ دینی احکام وعبادات سے کبھی غافل نہیں ہوتے۔ مکر وغداری اور عہد شکنی سے پرہیز کرتے ہیں۔ یہی وہ اخلاق حمیدہ ہیں جن سے انھیں سلطنت وسیاست کا بلند مرتبہ ملتا ہے اور مخلوق پر حکمرانی کرتے ہیں۔'' (مقدمہ: باب دوم فصل بیس)

آگے چل کر لکھتا ہے:

''پس اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کو ملک وسلطنت دینا چاہتا ہے تو پہلے اس کے اخلاق واطوار کی تہذیب کرتا ہے اور بخلاف اس کے جب کسی قوم سے دولت وسلطنت سلب کرنا چاہتا ہے تو پہلے وہ قوم مرتکب مذام ہوتی ہے اور فضائل پسندیدہ اس سے مفقود ہو جاتے ہیں۔ اور برائیاں بڑھنے سے ملک اس کے ہاتھوں سے نکل کر دوسروں کے قبضہ میں آجاتا ہے۔'' (ایضاً)

خاتمۂ بحث میں لکھتا ہے:

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

''پس جب یہ باتیں کسی قوم کی عصبیت والوں میں پائی جائیں تو سمجھنا چاہیے کہ یہ قوم بہت جلد سیاست عام اور مملکت کے مرتبے پر پہنچنے والی ہے۔ کیونکہ یہی باتیں خدا کی مقرر کردہ اقبال مندی اور سلطنت کی علامتیں ہیں اور یہی عادتیں خدا اس قوم سے سلب کر لیتا ہے جس سے ملک وسلطنت چھننا چاہتا ہے۔ اس لیے جب دیکھو کہ کسی قوم سے یہ باتیں مٹ چلی ہیں تو سمجھ لو کہ فضائل قومی روبہ زوال ہیں اور ملک عنقریب اس قوم کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔'' (ایضاً)

۲۔ جدید ٹیکنالوجی پر عبور

ہم پیچھے یہ بات بیان کر چکے ہیں کہ اس دنیا میں اقوام کو مختلف قسم کے چیلنجوں سے سابقہ پڑتا رہتا ہے۔ یہ چیلنجوں قدرت کی طرف سے بھی پیش آتے ہیں اور دوسری اقوام کی طرف سے بھی۔ چنانچہ ان کے لیے لازم ہے کہ ہر آن خطرات سے مقابلہ کی تیاری رکھیں۔ اگر وہ تیار نہیں تو تباہی ان کا مقدر ہے۔ خطرات سے مقابلے کی واحد صورت یہ ہے کہ قوم کو اپنے وقت کی ٹیکنالوجی پر غیر معمولی عبور حاصل ہو۔ اس کے افراد علوم وفنون کے جدید رجحانات سے بے خبر نہ ہوں۔ اس کی قیادت اپنی کمزوریوں اور دشمنوں کی طاقت سے بخوبی واقف ہو اور اس کے تدارک کے لیے بھرپور تیاری رکھتی ہو۔

یہ ٹیکنالوجی ہر دور کے اعتبار سے بدلتی رہتی ہے۔ مثلاً قرآن نے جب مسلمانوں کو اس امر پر متنبہ کیا تو گھوڑوں کا ذکر فرمایا:

''اور ان کے لیے جس حد تک کر سکو قوت اور بندھے ہوئے گھوڑے تیار رکھو، جس سے اللہ کے اور تمھارے ان دشمنوں پر تمھاری ہیبت رہے اور ان کے علاوہ کچھ دوسروں پر بھی جنھیں تم نہیں جانتے۔'' (الانفال ۸: ۶۰)

تیر، تلوار، ڈھال، نیزے، زرہ بکتر، خود، رتھیں، منجنیق، آتشی تیر اور بارود وغیرہ مختلف ادوار میں ایجاد کیے جاتے رہے اور ان کی مدد سے طاقت ور اور تعداد میں زیادہ دشمنوں کو شکست دی جاتی رہی ہے۔ ہم تاریخ کی ایک دو مثالوں سے اس بات کو واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ہکساس نامی حملہ آوروں نے ۱۷۰۰ ق م کے لگ بھگ مصر پر حملہ کیا اور بآسانی پورے مصر پر قابض ہو گئے۔ ان کی کامیابی کا ایک اہم سبب جنگ میں رتھوں کا استعمال تھا جو مصریوں کے لیے بالکل اجنبی ہتھیار تھا۔ ہکساس نے رتھوں کا طریقۂ استعمال میسوپوٹیمیا کی مٹانی قوم سے سیکھا، جبکہ انھوں نے گھوڑں کا یہ استعمال اہل ایران سے لیا تھا۔ مغربی ایشیا کے تمام لوگ جدید تبدیلیوں سے بخوبی واقف تھے۔ جبکہ عظیم الشان اہرام تعمیر کرنے والے اور ایک شان دار تہذیب کے حامل مصری دنیا سے الگ تھلگ رہنے کی بنا پر جنگی فنون میں تبدیلیوں سے ناواقف رہے۔ اسلامی تاریخ میں بھی متعدد ایسی ہی مثالیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ مثلاً صلیبی جنگوں کے ہیرو سلطان صلاح الدین ایوبی نے بیت المقدس پر قابض جنونی عیسائیوں کے خلاف جو کامیابی حاصل کی، اس کا ایک اہم سبب ان آتشی تیروں کا استعمال تھا جن کے ذریعے سے مخالفین کے لشکروں میں آگ لگ جایا کرتی تھی۔ اسی طرح اسلامی تاریخ سے ادنیٰ واقفیت رکھنے والا بھی یہ جانتا ہے کہ جنگ احزاب کے موقع پر جب پورا عرب مدینے

کی مختصر آبادی پر چڑھ آیا تھا تو مسلمانوں نے خندق کی عجمی تکنیک کو استعمال کر کے دشمنوں کو حیران کر دیا تھا۔

دور جدید میں ٹیکنالوجی سے پڑنے والا فرق تو اتنا نمایاں ہو چکا ہے کہ اس پر مزید گفتگو کرنا غیر ضروری ہوگا۔ پچھلے کئی سو برسوں میں اہل مغرب کی پے در پے کامیابیوں کے پیچھے کام کرنے والا بنیادی عامل جدید ٹیکنالوجی پر ان کا عبور ہے جس کا مقابلہ کسی اور ذریعے سے کرنا ممکن نہیں۔ مزید براں یہ کہ آج ٹیکنالوجی کی یہ مہارت صرف جنگی معاملات میں کام نہیں آتی، بلکہ معاشی اور تہذیبی میدانوں میں، جہاں اصلاً اب قومیں اپنی موت وزندگی کی جنگ لڑتی ہیں، فیصلہ کن کردار ادا کرتی ہے۔

تاہم یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ٹیکنالوجی کی یہ مہارت صرف ان قوموں میں جنم لیتی ہے جہاں تعلیم و مطالعہ کا عام رواج ہو۔ جن قوموں میں شرح خواندگی ناپنے کا پیمانہ دستخط کرنا ہو اور پھر بھی شرح خواندگی قابل شرم حد تک کم ہو، جہاں اہل علم و فضل کے مقابلے میں کھلاڑیوں، اداکاروں اور گلوکاروں کو قوم کے ہیروز کا درجہ حاصل ہو، جہاں ایک کتاب خریدنے کے بجائے کنسرٹ کا ٹکٹ خریدنا اور برگر کھانا زیادہ مرغوب ہو، وہ قومیں مصنوعی اقدامات سے کبھی بھی ٹیکنالوجی میں مہارت حاصل نہیں کر پاتیں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

خلاصۂ بحث

ہم نے تاریخ جیسے موضوع پر قلم اٹھایا اور اختصار کو اپنا شعار قرار دیا۔ اس لیے عین ممکن ہے کہ ہمارے بیانات کا ربط بعض مقامات پر زیادہ واضح نہ ہوا ہے۔ بہر حال ہم اس مختصر تحریر میں تاریخ بیان نہیں کر رہے، بلکہ فلسفۂ تاریخ کی روشنی میں قوموں کے عروج و زوال کے چند قواعد بیان کر رہے ہیں۔ جو لوگ تفصیلات کے طالب ہیں وہ ابن خلدون، گستاؤلی بان، ٹوائن بی اور اشپنگلر وغیرہ کے کام کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔

تاہم جو بات ہم نے پچھلے مباحث میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ تاریخ بے ربط انداز میں عمل نہیں کرتی۔ اس بارے میں اگر کوئی غلط فہمی پیدا ہوتی ہے تو وہ اس وجہ سے ہے کہ تاریخی عمل میں کام کرنے والے عناصر اس قدر بے گنتی اور متنوع ہوتے ہیں کہ معاصرین بھی ان کا حقیقی ادراک نہیں کر پاتے۔ بعد میں آنے والوں کے لیے تو ان سے اصولوں کا استنباط کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ پھر واقعات کی ایک سے زیادہ تاویلات کی گنجایش بھی باقی رہتی ہے۔ سب سے بڑھ کر مسئلہ یہ ہے کہ واقعات جب اگلی نسلوں تک پہنچتے ہیں تو اکثر ان کی صحت یقینی نہیں ہوتی۔ یہ بھی یقینی طور پر معلوم نہیں ہوتا کہ ہم تک واقعات کا ابلاغ مکمل بھی ہے یا نہیں۔ ان تمام مسائل کے باوجود فلسفۂ تاریخ پر اب تک جو کام ہو چکا ہے، اس سے یہ بات اب بالکل واضح ہے کہ تاریخی عمل اتفاقات کا نام نہیں ہے۔ جب یہ عمل ایک قوم کی زندگی میں پورے طور پر روبہ عمل ہوتا ہے تو اس کے نتیجے میں عروج و زوال کا ایک سلسلہ وجود میں آتا ہے۔ یہ سلسلہ جو کائنات کی ہر شے میں ظہور کرتا ہے، قوموں کی زندگی میں بھی ظہور پزیر ہوتا ہے۔ اور مختلف مراحل سے گزر کر ایک منطقی انجام تک پہنچتا ہے۔

عروج وزوال کے اس عمل میں قومی زندگی کے تمام عناصر کا ایک کردار ہوتا ہے۔ یہ نہ صرف اس پورے عمل سے براہ راست متاثر ہوتے ہیں، بلکہ اصلاً اس کے تخلیق کرنے والے بھی ہوتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قومی جسد اور اس کے عناصر قدرت کے کچھ قوانین کے پابند ہوتے ہیں، تاہم خدا نے انسان کو ایک صاحب اقتدار ہستی کے طور پر اس دنیا میں بھیجا ہے۔ اس لیے معاملات کی باگ اسی کے ہاتھ میں ہے۔ جب تک قوم کے افراد زندہ رہتے ہیں اور اخلاقی و مادی دنیا کے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں، تب تک عروج و سرفرازی ان کا مقدر رہتی ہے۔ مگر جب وہ اخلاقی اور مادی دنیا کے تمام تقاضوں کو نظر انداز کر کے خوش گمانیوں، توہمات اور جذباتیت کے سہارے زندگی گزارنے کی کوشش کرتے ہیں تو زوال سے بچنا ممکن نہیں رہتا۔

[باقی]

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

طالب محسن

عراق، امریکہ اور ہم

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

عراق امریکہ کا ہدف ہے۔ ہم یہاں یہ بحث نہیں کر رہے ہیں کہ عراق نے کوئی قصور کیا ہے یا نہیں۔ نہ ہمیں اس سے فی الحال غرض ہے کہ امریکہ انصاف اور امن کے قیام کے لیے یہ سب کچھ کر رہا ہے یا اس کا ہدف اپنے کچھ سیاسی اور معاشی مفادات ہیں۔

ہمارا مسئلہ ہم ہیں۔ اس صورت حال میں ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ کن خطوط پر سوچنا چاہیے اور ہم اس صورت حال سے نکلنے کے لیے کیا کچھ کر سکتے ہیں؟

فرض کیجیے، عراق مجرم ہے اور صدام حسین قرار واقعی سزا کا مستحق ہے۔ اس صورت میں مسلم اجتماعیت کس کے ساتھ کھڑی ہو۔ حق تو یہ ہے کہ حق کے ساتھ کھڑی ہو۔ لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ امریکہ کے ساتھ کھڑی ہو جائے اور عراق کی تباہی کے لیے امریکہ کی حلیف بن جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مذکورہ ہدف مسلم اجتماعیت اپنے انداز میں پر امن ذرائع سے حاصل کر سکتی ہے۔ اسے چاہیے کہ وہ آگے بڑھ کر یہ اعلان کرے کہ مسلمان امریکہ کی جارحیت میں اس کے ساتھی نہیں ہیں اور مسئلہ کے حل کے لیے صرف سفارتی ذرائع اختیار کیے جائیں۔ خود مسلم اجتماعیت بھی اپنے سفارتی ذرائع کو صورت احوال کی اصلاح کے لیے پوری قوت کے ساتھ استعمال کرے اور صدام حسین کو عراق اور بحیثیت مجموعی امت کی تباہی کا باعث نہ بننے دے۔ جبکہ افغانستان کے معاملے میں اس طرح کی خاموشی اختیار کر کے ہم نقصان اٹھانے کا تلخ تجربہ کر چکے ہیں۔ مسلم عوام آگے بڑھیں اور جنگ کے خلاف آواز اٹھانے والوں کی طاقت میں اضافہ کریں اور اپنے ملک کے حکمرانوں پر یہ دباؤ بڑھائیں کہ وہ امن کے لیے جدوجہد میں زیادہ سرگرم ہوں۔

موجودہ خاموشی سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلم امت پر شدید بے بسی کی حالت طاری ہے۔ یہ حالت واضح ہے کہ پے در پے ناکامیوں کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہے۔ ناکامیوں کے اس اثر کو زائل کرنے کے لیے اس حقیقت کا ادراک کرنا چاہیے کہ ہم

نے پچھلے دوسو سالوں میں حقیقی جواز اور حقیقی تیاری کے بغیر ٹکراؤ کی راہ اختیار کیے رکھی ہے۔ جب جواز اور تیاری حقیقی نہ ہو اور آدمی اپنی سعی سے غیر معمولی توقعات وابستہ کر لے، لیکن نتیجہ کامل ناکامی کی صورت میں نکلے تو یہ کیفیت پیدا ہونا لازمی ہے۔ مایوس ہو کر بیٹھ جانا کوئی طریقہ نہیں ہے۔ ناکامی کا ایک سبب تھا۔ ہمارا کام یہ ہے کہ اس سبب کو دور کریں اور نئے فیصلے اور نئے عزم کے ساتھ جدوجہد میں جت جائیں۔

عراق امریکہ تناظر میں ہمارا پہلا کام امریکہ کے لیے حملے کا اخلاقی جواز ختم کرنا ہے اور اس کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ امت مسلمہ اس مسئلے کو اپنے ہاتھ میں لے اور ہر جائز شکایت کو دور کرنے کی راہ اختیار کرے۔

فرض کیجیے، امریکی عزم جارحیت محض ظلم ہے۔ امریکہ طاقت کے نشے میں ہر اخلاقی قدر کو پامال کرنے پر تلا ہوا ہے۔ امریکہ کہانی کا 'بھیڑیا' اور عراق 'بھیڑ کا بچہ' ہے۔ لیکن ایسا کیوں ہے کہ عراق خود مسلم برادری میں اکیلا رہ گیا ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ عالمی برادری میں خود مسلمان اگر مجرم نہیں ہیں تو اپنی بعض غلط پالیسیوں کے باعث بدنام ضرور ہیں۔ دوسرے بہت سے اسباب کے ساتھ یہ ایک سبب ہے جس کی وجہ سے مسلم امت سفارتی محاذ پر عالمی برادری کا سامنا نہیں کر پاتی۔ یوں امریکہ جس مسلم ملک کو ہدف بنانا چاہتا ہے، اسے اکیلا پاتا ہے۔

یہاں بھی ہمارا کام یہ ہے کہ ہم ظلم کو ظلم کہیں اور ایسے حالات پیدا کر دیں کہ امریکی جارحیت ننگی جارحیت نظر آئے اور ہم عالمی ضمیر کو اخلاقی طاقت سے جھنجھوڑ سکیں۔

دونوں صورتوں میں جو لائحۂ عمل ہم نے تجویز کیا ہے، اس کا تعلق مسلم اجتماعیت سے ہے۔ انفرادی اعتبار سے ہر مسلمان صرف اس بات کا مکلّف ہے کہ وہ اپنی اپنی حکومتوں کو صحیح لائحۂ عمل اختیار کرنے کی تلقین کرے اور اس کے لیے اگر ضرورت ہو تو پرامن جلسوں اور جلوسوں میں شریک ہو۔ منکر کے استیصال کے لیے جدوجہد لازم ہے، لیکن اس کے لیے کسی بھی سطح پر کوئی ایسا طریقہ اختیار نہیں کیا جا سکتا جو اخلاقی، قانونی اور دینی ضوابط کو پامال کر دے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

O

دل ہے، مگر کسی سے عداوت نہیں رہی
دنیا وہی ہے، ہم کو شکایت نہیں رہی

آزردۂ فراق تھے، پھر بھی شبِ وصال
عرضِ نیازِ شوق کی عادت نہیں رہی

دنیا ترا نصیب، نہ عقبیٰ ترا نصیب
اب زندگی میں موت کی زحمت نہیں رہی

وہ دن قریب آ لگا آئے گی جب صدا
'بابر بہ عیش کوش' کی مہلت نہیں رہی

میں جانتا ہوں دہر میں اس قوم کا مآل
علم و ہنر سے جس کو محبت نہیں رہی

خوفِ خدا کے بعد پھر اک چیز تھی حیا
وہ بھی دل و نگاہ کی زینت نہیں رہی

درماندۂ حیات ہوں، دل تو نہیں لگا
اتنا ضرور ہے کبھی وحشت نہیں رہی

سرما کی شام ہے کوئی اجڑے دیار میں
جس زندگی میں شوق کی حدت نہیں رہی

دنیا کا اقتدار بھی خواب و خیال ہے
خواب و خیال میں اگر ندرت نہیں رہی

اس رہ روی میں جادہ و منزل بھی دیکھ لیں
یارانِ تیز گام کو فرصت نہیں رہی

شعر و سخن کی، بادہ و ساغر کی گفتگو
جی چاہتا ہے، پر وہ طبیعت نہیں رہی

پیدا کہاں یہ علم و محبت کا رازداں
تم کو فقیر سے کبھی صحبت نہیں رہی

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org